پرمود بھارتیہ
بدچلن

بدچلن

بدچلن

(افسانے)

پرمود بھارتیہ

مانک پبلی کیشنز کریگ کاٹج اسٹیٹ، ہیمپٹن
کورٹ، مسوری

ناشر:۔ مصنف
اشاعت:۔ 2003
تعداد:۔ 600
قیمت:۔ /-100
کمپوزنگ:۔ بہلول احمد

BADCHALAN
(SHORT STORIES)
Rs. 100/-
Craig Cottage Estate, Hampton Court,
Mussoorie-248179

شائلین

کے

لئے

عاجل پریمی۔پرمود بھارتیہ: ڈاکٹر ارتضیٰ کریم

عاجل پریمی

پرمود بھارتیہ

پرمود بھارتیہ نئی کہانی کے دروازے پر ابھی دستک دے رہے ہیں، اردد
کہانی کا دروازہ ابھی ان کے لئے وانہیں ہوا ہے مگر عنقریب ہوجانے کی
توقع رکھنی چاہیئے ۔ یوں بھی ادب میں داخلہ اور تخلیقی ادب میں داخلے کی
بڑی سخت شرائط ہیں اور ابھی ان تمام تقاضوں کو پورا کرنا پرمود بھارتیہ کے

لئے ممکن بھی نہیں ہے لیکن وہ جس لگن اور تسلسل سے کہانیاں لکھ رہے ہیں وہ ان کے روشن مستقبل کا اشاریہ ہے۔

پرمود بھارتیہ سنسکرت کے راستے اردو کہانی اور ادب میں وارد ہوئے ہیں، اسلئے زبان، کردار، واقعات اور ماحول ان سب پر اس کا اثر واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کہانیاں قاری کو پکڑتی ہیں، دیر تک اور دور تک اپنے ساتھ شریک رکھتی ہیں کئی کردار مثلاً کسم، مدھو، سپنا، ایل پی صاحب اپنی انفرادیت اور دل کشی کے باعث یاد رہ جاتے ہیں یہ ایسی خوبی ہے جو کسی افسانہ نگار کے ہاتھ لگ جائے تو اس کی کامیابی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔

اردو کہانی کے سفر پر نگاہ ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہر زمانے میں کہانیوں میں دو یا دو سے زیادہ متوازن رجحان نظر آتے ہیں مثلاً اگر خالص سماجی مسائل پر کہانیاں لکھی جاتی رہی ہیں تو اسی زمانے میں رومانی، اصلاحی اور عام فہم کہانیوں کے لکھنے والے بھی بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں دراصل یہ بڑی تعداد والے ہی ''کم تعداد'' والوں کی شناخت اور معیار بنانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور یہی بڑی تعداد والے کہانی کا رقاری کے حافظے میں اپنی کہانیوں اور کرداروں کے ساتھ قائم اور دائم رہتے ہیں۔

پرمود بھارتیہ کا شمار افسانہ نگاروں کی اسی برادری میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن

کیا پتہ ''معیار'' قائم کرتے کرتے وہ خود ''اقلیتی طبقہ کے کہانی کاروں'' میں شامل ہو جائیں۔

ان کی کئی کہانیاں مجھے ذاتی طور پر اسلئے پسند ہیں کہ یہ ہمیں ماضی میں لے جاتی ہیں یعنی وہ ماضی جب ہم کاغذ کی کشتی بناتے ہیں، ریت کے گھروندے تعمیر کرتے ہیں، بارش کے پانی میں اس ناؤ کو پار لگانے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسا کرتے وقت اچانک ہم اس کشتی کو پھاڑ دیتے ہیں یا ریت کے گھروندے کو مسمار کر دیتے ہیں، وہ ماضی جہاں تپتی دوپہر پر چاندنی کا گمان کیا بلکہ یقین ہوتا ہے اور کوئی ننگے پاؤں کسی کے دیدار کی خاطر گھنٹوں چھت پر منتظر رہتا ہے، وہ ماضی جب زلف لہراتی ہے تو تمام تر داخل و باطن معطر ہو جاتا ہے جب ممکن اور ناممکن میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا چنانچہ پرمود کی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی قاری تجارتی سماج اور رشتہ سے نکل کر پریم کی وادی میں کھو جاتا ہے جہاں مسائل ہیں بھی تو پریم ڈگر پر چل کر مسکراتے ہوئے حل کیا جا سکتا ہے ان کی بعض کہانیاں مثلاً **بد چلن، خوش نصیب، ہوائی چپل** اور **حیران** بہت ہی کامیاب کہانیاں ہیں اور انہوں نے جس منفرد تیور کے ساتھ ان کہانیوں کو تخلیق کیا ہے ان کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اگر پرمود بھارتیہ اسی طرح

دستک دیتے رہے تو بہت جلد اردو کہانی کا دروازہ نہ صرف ان کے لئے وا ہوگا بلکہ اس باب میں وہ اپنے دستخط بھی ثبت کریں گے۔

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم
ریڈر، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی

اپنی بات

ہندی اور اردو کے مشہور افسانہ نگار پریم چند نے ایک بار کہا تھا ''شاعری آنکھیں بند کر کے کی جاتی ہے جب کہ نثر آنکھیں کھول کر لکھی جاتی ہے''۔ یعنی نثر میں کچھ لکھنا شاعری کے مقابلہ کافی مشکل کام ہے۔ سنسکرت کے مشہور نقاد وامن نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ نثر مصنف کی کسوٹی ہوتی ہے

کچھ اسی طرح کے خیالات مغرب کے بھی کئی نقادوں کے رہے ہیں۔ مجھے

خاص طور پر پریم چند، ڈی۔ایچ۔لارینس اور سنسکرت کے وشنو شرما کے افسانوں کو پڑھنے کا موقع ملا ہے اور ان تمام افسانوں کو پڑھ کر اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ایک اچھا افسانہ وہی ہو سکتا ہے جو پوری طرح قاری پر ظاہر ہو جائے اور اپنی بات بنا کسی لاگ لپیٹ کے کہہ سکتا ہو۔

۱۹۸۴ء میں میں نے پٹنہ کالج کے رسالے کے لئے پہلا افسانہ لکھا تھا جو شائع نہ ہوا۔اسی رسالے کے لئے میں نے ایک مقالہ لکھا تھا ''رام چرت مانس میں خواتین کا مقام'' جو نہ صرف شائع ہوا بلکہ کافی دوستوں نے مجھے اس مقالے پر مبارک باد بھی پیش کی۔اس کے بعد اسی سال میں نے پٹنہ کے ایک افسانہ نگار قیصر رضا کی کہانی 'پرائشچت' کا ہندی ترجمہ کیا جو ہندی کے مشہور رسالے 'جیوتسنہ' میں چھپا۔اس رسالے کے مدیر مشہور ہندی ادیب رابن شاپشپ تھے۔بعد میں جب میں دہلی یونیورسٹی آیا تو وہاں ڈاکٹر مظہر احمد کے انشائیہ 'اب سنور کے نکلے گا حسن کارخانے سے' کا ہندی میں ترجمہ کیا جو 'مانسی' میں چھپا۔پھر ۱۹۹۳ء میں قومی آواز میں میرا ایک تحقیقی مقالہ 'دنیا کا پہلا ناول نگار سبندھو' شائع ہوا۔اسی درمیان دہلی کے مشہور ہدایت کار شیکھر ویشنوی کے ایک ہندی ڈرامے کا اردو ترجمہ بھی کرنے کا موقع ملا جسے انہوں نے پھر اردو اکادمی دہلی کے ڈرامہ فیسٹویل میں اسٹیج بھی کیا تھا۔اور میری زندگی کا سب سے یادگار موقعہ تب آیا جب اپنے دوست صبا پرویز کی ایم۔فل کے ایک پرچہ میں (ان کا دہنہ ہاتھ

ٹوٹ جانے کی وجہ سے) مجھے بطور Writer بننے کا موقعہ ملا ۔ اور بھائی صبا پرویز اس پرچہ میں اچھے نمبروں سے کامیاب بھی ہوئے ۔

یہ تھی میری اردو زبان سے جان پہچان کی مختصر داستان ۔

جہاں تک افسانوں کا تعلق ہے ۱۹۹۴ء میں میرا پہلا اردو افسانہ خوش نصیب ، پرواز ادب میں شایع ہوا جو آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے نشر بھی ہوا ۔ اس کے بعد پاسباں ، نیا دور ، ایوان اردو اور تعمیر میں بھی کئی افسانے شائع ہوئے ۔ ان تمام افسانوں کا ایک مجموعہ میں قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں ۔ یہ تمام افسانے اپنے مقصد میں کتنے کامیاب ہوئے ہیں یہ تو قارئین ہی بتائیں گے ۔ مجھے ان کے ردعمل کا انتظار رہے گا ۔

اس مجموعہ کے لئے جناب ڈاکٹر ارتضیٰ کریم صاحب نے جو مقدمہ لکھا ہے اس سے اس کتاب کی خوبصورتی کئی گنا بڑھ گئی ہے ۔ میں کن الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کروں سمجھ نہیں آتا ۔ میں ڈاکٹر مظہر احمد (ذاکر حسین دہلی) ، ڈاکٹر محمد رضی الرحمٰن (گورکھپور یونیورسٹی) ، ڈاکٹر ریاض احمد (جموں یونیورسٹی) ڈاکٹر محمد نوشاد عالم (ذاکر حسین کالج ، دہلی) اور ڈاکٹر ششی شیکھر سنگھ (دیش بندھو کالج ، دہلی) کا بھی مشکور ہوں کہ انھوں نے وقتاً فوقتاً ہمت افزائی بھی کی اور مفید مشورے بھی دیئے ۔ بھائی صبا پرویز صاحب جنہوں نے نہ صرف مجھے اس مجموعہ کی اشاعت کے لئے تحریک دی بلکہ اس کی چھپائی میں بھی تعاون فراہم کیا ، کا

میں خاص طور پر ممنون ہوں۔اور بھائی بہلول احمد کا جنہوں نے کمپیوٹر پر اس کی خوبصورت کمپوزنگ کی ہے کا بھی شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پرمود بھارتیہ
میونسپل پوسٹ گریجویٹ کالج مسوری

خوش نصیب

صبح نو بجے حسب معمول میں لائبریری کے لئے نکل جاتا ہوں۔ناشتہ لیکر
اب نکلنے ہی والا تھا کہ شیکھر جو میرا سب سے اچھا دوست ہے آ کر ایک لفاف
دیتا ہے۔خط اسی کے نام تھا۔اس خط میں اس سے تھوڑی بہت دعا سلام کی گئی
تھی اور اس خط کے ساتھ ایک چھوٹا سا چٹ بھی تھا جو میرے لئے تھا۔اس کی
ایک طرف لکھا تھا ''نو'' اور دوسری طرف ''فارمد ھوکر''۔
کسم کے پاس بدتمیزی بھرے خط کو دیکھکر نہ صرف مجھے بلکہ شیکھر کو بھی غصہ

آیا۔ غصے میں وہ پتہ نہیں کیا کیا بڑبڑاتا رہا'' پتہ نہیں آج کی لڑکیاں اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہیں۔لڑکوں کا دل جیسے کھلونا ہو گیا ہے ان کے لئے' جب تک چاہا کھیلا اور جی بھر گیا تو اٹھا کر پھینک دیا۔۔۔''

پھر غصے میں بڑبڑ کرتا ہوا وہ میرے باروچی خانہ کی طرف چل دیا چائے بنانے اور میں اس خوبصورت تحریر ''نو'' کو دیکھتا رہا اور اپنے ماضی کے دریچے میں جھانکتا رہا۔۔۔

کسم میری کلاس فیلو تھی یعنی میں اور وہ تقریباً ڈھائی سو طلباء و طالبات کے درمیان ایسے تھے جو دہلی سے باہر کے رہنے والے تھے۔شروع کے دو تین دنوں میں ہی دوران تعارف مجھے یہ بات معلوم ہوئی۔ہم لوگ ایم۔اے۔سال اول میں داخل ہوئے تھے۔

کسم میں سب سے بڑی خاصیت یہ تھی کہ وہ عموماً سنجیدہ ہی رہتی تھی۔ میں چوں کہ سبھی لڑکوں میں مقبول و مشہور تھا، سبھی پروفیسر بھی مجھے بہت پیار کرتے تھے اس لئے مجھے کبھی کسی سے گفتگو کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ایک دن وہ موقع بھی میسر آیا جس کا مجھے کئی دنوں سے انتظار تھا۔اس دن میں پروفیسر چترویدی کی کلاس میں تھوڑی دیر سے پہنچا۔پوری کلاس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی صرف کسم کی بغل والی سیٹ اتفاق سے خالی تھی میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔'' میڈم! اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں آپ کی بغل والی کرسی پر بیٹھ جاؤں''؟

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں!'' کسم نے مسکرا کر کرسی پر رکھی اپنی کتابیں ہٹا لیں۔

''آج کون سا چیپٹر چل رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی، میگھدوت کا سولہواں (۱۶) شلوک''، کسم نے کہا۔

پروفیسر چترویدی ہم لوگوں کو کالیداس کا میگھدوت پڑھاتے تھے۔اس کے بعد ہم لوگوں نے کوئی بات نہیں کی۔آدھے گھنٹے بعد کلاس ختم ہو گئی اور کافی بریک (Coffee Break) میں سبھی باہر لان میں نکل آئے۔آرٹس فیکلٹی (Arts Faculty) کا یہ لان تاریخی لگتا ہے دہلی یونیورسٹی نے انھیں طلبا کے لئے گپیں مارنے کے لئے بنایا تھا۔میں نے کسم سے کہا'' آیئے نا' آج میری طرف سے آپ کافی پیجئے!''

''نو تھینکس''

''نہیں نہیں تکلف کی کوئی بات نہیں! میں کوئی آپ کو روز روز تھوڑی پلاؤں گا!'' میں نے تھوڑا اصرار کیا۔

''تب ٹھیک ہے۔'' اور اس نے میری دعوت قبول کر لی۔اور ہم لوگ کینٹین میں کافی کی چسکیاں لینے لگے۔اسی دوران میں نے اس کے متعلق بھی کچھ معلومات حاصل کر لیں۔مثلاً۔۔۔'' آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟''

''میں لدھیانہ کی ہوں اور میرا نام کسم شرما ہے اور آپ؟'' اس نے تھوڑی شوخی سے میرے اوپر بھی اپنی نظریں گڑا دیں۔

''مجھے لوگ مدھکر شاستری کہتے ہیں اور مغربی بنگال کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔''میں نے بھی کچھ اسی انداز میں جواب دیا۔

''کیا وہاں ایم۔اے۔کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے؟''

''ہاں ہے کیوں نہیں، بہت ہے''

''تب آپ یہاں کیسے؟''

''اگر یہاں نہیں آتا تو آپ جیسی حسین و ذہین لڑکی سے ملاقات کیسے ہوتی!''میں نے تھوڑی اس کی تعریف کی۔اس کے چہرے پر خوشی اور شرم کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔دو تین منٹ اس پر یہی کیفیت طاری رہی۔وہ نظریں جھکائے کھڑی رہی اور پھر اچانک یہ کہکر چلی گئی،''آپ بڑے شریر ہیں۔''

اس کے شرمانے کی یہ ادا مجھے اچھی لگی۔اس کے بعد دن گذرنے لگے اور ہماری ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ہم لوگ کبھی کبھی تو کچھ کلاس چھوڑ بھی دیتے اور یونیورسٹی گراؤنڈ میں بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتے اور اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے۔وہ روز لائبریری میں میرا انتظار کیا کرتی۔میں پڑھنے لکھنے میں اکثر اس کی مدد کیا کرتا تھا اور دھیرے دھیرے مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ میرے دل میں اس کے لئے کچھ کچھ ہونے لگا ہے۔پوری کلاس میں یہی ایک لڑکی تھی جو سب سے مختلف تھی اور مجھے پسند تھی۔ایک دن میں نے پوچھ بھی لیا''اچھا یہ بتاؤ کسم پوری کلاس میں تم کسی لڑکے سے بات نہیں کرتی، صرف مجھ سے ہی

کیوں کرتی ہو؟''

''دیکھو مدھو! مجھے جو اچھا لگتا ہے میں اسی سے بات کرتی ہوں'' اور یہ کہکر پھر اس نے گردن جھکا لی مجھے اس کی یہ ادا بڑی پیاری تھی۔ جب بھی اسے اپنی بات پر شرم آتی وہ تھوڑی دیر کے لئے گردن جھکا لیتی تھی۔

دن گذرنے لگے۔ ایم۔ اے سال اول کے امتحان کا نتیجہ بھی آ گیا۔ پھر ہم لوگ ایم۔ اے سال آخر میں چلے گئے۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے سے کچھ اس قدر قریب ہو گئے کہ شعبہ کے ہی نہیں بلکہ دیگر شعبوں کے طلبا کو بھی بھنک لگ گئی تھی کہ ان دونوں کے درمیان کچھ نہ کچھ کھچڑی ضرور پک رہی ہے۔ ایک دن دوران گفتگو میں نے پوچھ بھی لیا۔ ''کسم! تم ایم۔ اے کے بعد کیا کرو گی؟''

''کوئی ڈھنگ کی نوکری ڈھونڈوں گی۔''

''پھر شادی بھی۔۔۔۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں!۔''

''اچھا یہ بتاؤ تم اپنے ہونے والے شوہر میں کون کون سی خاصیت ڈھونڈنا چاہو گی؟'' میں نے دل تھامتے ہوئے کہا۔

''میں ایک ہی خاصیت اس میں دیکھوں گی۔ وہ کیسا بھی ہو کالا ہو گورا ہو لنگڑا لیکن مجھے ٹوٹ کر پیار کرتا ہو۔ لیکن میری ایسی قسمت کہاں! لیکن تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ۔۔۔۔'' اور اسی دوران اس کی بس آ کر اسے لے گئی۔ میرے

دل میں تو لڈو پھوٹنے لگے۔ وہ اس لئے کہ میں تو اس کو بے حد پیار کرنے لگا تھا اور لنگڑا ابھی نہیں تھا۔ مجھے لگا کہ اس کی شرط بالکل ہی آسان ہے۔

چھ مہینے اور گذر گئے۔ فروری کا مہینہ تھا۔ ہم دونوں امتحان کی تیاری میں لگے ہوئے تھے اور اندر ہی اندر دونوں کے دلوں میں طوفان ۔۔۔ لائبریری میں میں صرف اس کی طرف ہی دیکھتا رہتا تھا۔ کتابیں سامنے ہوتی تھیں اور ان صفحات میں کسم کی تصویریں دکھائی دیتی تھیں۔

ایک دن میں نے فیصلہ کر ہی لیا کہ آج اپنے دل کی بھڑاس نکال ہی لوں گا ۔اس دن فیصلہ لینے میں مجھے تین گھنٹے لگے۔ میں گیارہ بجے لائبریری پہنچا۔ اندر گھستے ہی بک ایشو کاؤنٹر (Book Issue Counter) کے پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی کسم مل گئی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنا چہرہ کتاب سے ڈھک لیا۔ جب بھی وہ مجھ سے ناراض ہوتی تو وہ اپنی کتاب سے اپنا چہرا ڈھک لیتی ۔میں نے منانے کی کوشش کی ۔۔ ''آج چاند کیوں اداس ہے۔؟''

''۔۔۔'' خاموشی نے میرا استقبال کیا۔

''آخر ناراضگی کی کچھ وجہ بھی تو ہونی چاہئے۔''

''۔۔۔جواب میں پھر خاموشی

''اچھا سکھی! غلطی ہوگئی۔اب تو معاف کر دیجئے۔'' میں اپنے دونوں کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسے منانے کا

یہی ایک ہتھیار تھا میرے پاس۔آخری ہتھیار۔ جیوں ہی میں کان پکڑتا وہ کتاب ہٹا لیتی اور کہتی۔ ''بے شرم۔'' اور پھر میری پیٹھ پر دو تین تھپڑ پیار سے رسید کرتی۔آج بھی ایسا ہی ہوا۔

''تمہیں معلوم ہے میں صبح سے انتظار کرتے کرتے پاگل ہوئی جارہی ہوں''

''کیا کروں! کچھ کپڑے دھو رہا تھا، اسی لئے دیر ہوگئی۔خیر چلو کہیں چلتے ہیں۔'' میں نے باہر لان کی طرف اشارہ کیا۔پھر ایک درخت کے نیچے دونوں بیٹھ گئے خیریت وغیرہ پوچھنے کے بعد میں سیدھا اپنی بات پر آ گیا۔

''دیکھو کسم! میں آج تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ یہ بات ویسے بہت پہلے ہی مجھے کہنی چاہئے تھی لیکن۔۔۔خیر۔۔۔'' میں تھوڑا رکا۔کسم کی بھی سانس رک سی گئی۔

''کسم! میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں اور تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا یہی کہنے کے لئے آج اتنی دیر سے آئے؟''

''ہاں!''

پھر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ریلا نکلنے لگا، جو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ جب یہ ریلا تھوڑا تھما تب میں نے اس سے دھیرے سے پوچھا۔ ''کسم' کیا مجھے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا؟''

''نہیں مدھو!''

''پھر؟''

''تم نے میری آنکھ دیکھی ہے؟'' اس نے تھوڑی بے چارگی سے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے سب کچھ دیکھ کر ہی پروپوز (Propose) کیا ہے۔ اگر تم اس غریب کی بیوی بننا قبول کرلو تو مجھے بڑی خوشی ہوگی اور میں دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان اپنے کو سمجھوں گا۔'' میں نے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ دی۔

''مدھو! میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔''

''تم پوری طرح سوچ کر جواب دے سکتی ہو۔ کل ساڑھے دس بجے میں اپنے کمرے میں تمہارا انتظار کرونگا۔''

''اچھا' ایک بات بتلاؤ۔ پوری کلاس میں تمہیں میں ہی ایک لڑکی ملی جس پر تمہارا دل آیا؟ میں خوبصورت بھی نہیں ہوں اور میری آنکھ۔۔۔'' یہ کہہ کر اس کی آنکھ سے ایک دو موتی اور ڈھلک گئے۔

''دیکھو کسم! کس نے کہا کہ تم خوبصورت نہیں ہو۔ میرے لئے تو تمہی میری رمبھا اور مینکا ہو۔ اور پھر تمہاری آنکھیں۔۔۔ کس نے کہہ دیا وہ صرف تمہاری آنکھیں ہیں۔ وہ تو اب ہماری آنکھیں ہیں۔'' میں نے پیار سے اسے سمجھایا۔

میرے ایسا کہتے ہی اس کی آنکھوں نے پھر سے آنسوؤں کی بارش کرنی شروع کر دی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ آنسو غم کے نہیں بلکہ خوشی کے تھے۔ کسم کی ایک آنکھ میں بالکل روشنی نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ احساس کمتری کا شکار تھی۔

پانچ بج چکے تھے۔ اچانک ہماری نظر گھڑی پر پڑی اس نے اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا ' اب چلنا بھی ہے یا یہیں گوتم بدھ کی طرح درخت کے نیچے دھونی رمانی ہے؟ ۔''

پھر ہم لوگوں نے سائنس فیکلٹی کے کافی ہاؤس میں جا کر سانبھر بڑا، برگر' کولڈ ڈرنک اور کافی وغیرہ لیا۔

''اور کچھ لینا ہے؟'' میں نے کسم سے پوچھا

''ہاں''

''کیا؟''

''ایک ہاضمولہ!'' ۔ اور پھر ہم لوگ ہنسنے لگے۔ وہ مذاق بھی اچھا کر لیتی تھی۔ پھر وہاں سے ہم لوگ پٹیل چیسٹ بس اسٹاپ پر بس لینے کے لئے آ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں بس آ گئی۔

''کل ساڑھے دس بجے انتظار کرونگا۔ اگر نہیں آئی میں سمجھ لوں گا کہ تمہاری '' نا'' ہے'' میں نے اسے بس میں چڑھاتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن ٹھیک ساڑھے دس بجے کسم ہرے سوٹ و ہرے دوپٹے میں حاضر

ہوئی ۔ میں سمجھ گیا کہ جواب ''ہاں'' میں ہے تبھی تو صحیح وقت پر آئی ہے اور وہ بھی ہرے لباس میں یعنی لائن کلیئر۔

لیکن یہ کیا! آتے ہی اس نے جو جواب دیا اس کا تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

'' سنو مدھو ! پہلے وعدہ کرو کہ میرے جواب سے تم بالکل نارمل (Normal) رہو گے۔'' کسم کے اس جملے نے میرے دل کی دھڑکنیں بڑھا دیں ۔ پھر آگے اس نے کہا '' مدھو ! میں بہت ہی خوش نصیب لڑکی ہوں جسے تمہارے جیسا دوست ملا ۔۔۔ لیکن میں تم سے شادی کر کے ایک اچھا دوست کھونا نہیں چاہتی ۔ میں رات بھر تمہاری تجویز پر غور کرتی رہی اور صبح اس نتیجے پر پہنچی ہوں ۔

'' اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کیا ہے؟''

''ہاں ۔'' لیکن وعدہ کرو کہ تم ہمیشہ کی طرح ہنستے رہو گے اور میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہو گے۔''

'' وعدہ تو نہیں کرتا لیکن کوشش کرونگا۔'' پھر میں اسے لائبریری تک چھوڑ کر پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔ آتے ہی رضائی میں گھس گیا۔ حسب توقع جواب نہ ملنے کے غم نے مجھے نڈھال کر دیا اور دھیرے دھیرے میرا بدن تپنے لگا اور اسی کرب اور بے چینی میں میں کروٹیں بدلتا رہا۔

تین بجے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ پھر کسم کھڑی تھی لیکن اس وقت اس کے ساتھ شیکھر تھا۔ اندر آ کر اس نے میرے کان میں کہا'' یار! تو کتنا خوش نصیب ہے۔ دیکھ! ابھی جب کسم گھر جانے لگی تو تم سے ملنے آ گئی۔ چلو اسے بس اسٹاپ تک چھوڑ دو۔'' میں نے خود کو کسی طرح سنبھالا اور اسے بس اسٹاپ تک چھوڑا۔

شام میں لوٹ کر آنے پر میں نے آج کی باتوں پر غور کیا۔ آخر کسم پھر لوٹ کر کیوں آئی تھی! یا ہو سکتا ہے وہ میرا حال دیکھنے کے لئے آئی ہو۔ کیا پتہ آج اس کی '' نا'' کہیں میری محبت کا امتحان نہ لے رہی ہو!

میرا یہ اندازہ صحیح نکلا۔ دوسرے دن وہ میرے پاس آئی اور بولی '' مدھو! تم سے کچھ بات کرنی ہے۔۔۔'' لیکن اس کے کل کے برتاؤ نے مجھے اتنا زخمی کر دیا تھا کہ آگے بات کرنا میں نے اپنی توہین سمجھی میں نے کہہ دیا۔ '' اب مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔''

پھر وہ مایوس ہو کر چلی گئی۔ مجھے لگا کہ وہ کل کے اپنے کئے پر شاید پشیمان ہے اور اپنی '' نا'' کو '' ہاں'' میں بدلنا چاہتی ہے۔

اپریل کا مہینہ آ گیا۔ امتحان ہونے لگے۔ امتحان کے بعد وہ اپنے گھر لدھیانہ چلی گئی۔ مجھے امید تھی کہ وہ اپنے کئے پر خط کے ذریعے شرمندگی کا اظہار کرے گی۔ لیکن آج اس کا یہ مختصر سا خط وہ بھی کسی اور کے نام۔ اور میرے لئے اس

چھوٹے سے چٹ پر پیغام۔ ''نو''۔۔۔

تبھی شیکھر باورچی خانے سے چائے بنا کر لایا۔

''کہاں کھو گئے؟'' شیکھر نے چائے کی پیالی بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں کہیں نہیں۔ بس یوں ہی ایک بات یاد آ گئی تھی۔''

''کون سی بات؟''

''ایک دن تمہیں نے تو کہا تھا کہ تم کتنے خوش نصیب ہو مدھو! کسم تمہیں بہت پیار کرتی ہے۔''

''ہاں' لگتا ہے میں نے سچ ہی کہا تھا۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ اس لئے کہ اگر اس بے وفا اور بدتمیز لڑکی سے تمہاری شادی ہو جاتی تو تمہارا جیون واقعی نرک بن جاتا۔ کہیں جیون کے مجدھار میں جا کر اگر ساتھ چھوڑ جاتی تو تم کہیں کے نہ رہتے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ وہ کنارے پر ہی ساتھ چھوڑ گئی۔'' یہ کہہ کر وہ تھوڑا رکا اور چائے کی ایک چسکی لے کر بولا۔ ''اب بتاؤ تم خوش نصیب ہوئے یا نہیں؟''

پھر ہم لوگوں نے اس لفاف اور اس چٹ کو پھاڑ کر کوڑے دان میں ڈال دیا جیسے اپنے ماضی کی یادوں کے صفحے کو پھاڑ کر کوڑے دان میں پھینک رہے ہوں۔

آج شیکھر نے چائے بڑی لذیذ بنائی تھی۔

☆

ہوائی چپل

میں روز کی طرح آج بھی اپنی چھت پر دھوپ کھانے کے ساتھ ساتھ اپنی نئی کہانی کا پلاٹ بھی تیار کر رہا تھا۔اسی درمیان سڑک کے اس پار سامنے کی بالکنی میں نکلی ہوئی الگنی پر نیلے رنگ کی چیک والی ایک لنگی لہرائی ۔لگتا ہے ایل ۔ پی ۔ صاحب آ گئے ہیں ۔ نیلے رنگ والی یہ چیک دار لنگی تبھی اس الگنی پر آتی ہے جب ایل ۔ پی ۔ صاحب دہلی سے یہاں تشریف لاتے ہیں ۔ ویسے یہ لنگی مہینے میں

بدچلن

ایک یا دو دن سے زیادہ کبھی نظر نہیں آتی ۔ جب بھی وہ دہلی سے آتے ہیں صبح صبح نہا کر اپنی بھیگی لنگی سکھانے کے لئے اسی ٹنگنی پر ڈال دیتے ہیں ۔

یہ ایل ۔ پی ۔ صاحب دراصل ہمارے پڑوس میں رہنے والی سپنا جی کے شوہر ہیں ۔ سپنا جی بغل کے ریلوے اسکول میں استانی ہیں ۔ تین سال پہلے جب اس اسکول میں ان کا تقرر ہوا تھا تبھی سامنے والا یہ کوارٹر انہیں رہنے کے لئے ریلوے نے دیا تھا ۔ چھ مہینے قبل دہلی میں ان کی شادی ہوئی ہے ۔ شوہر دہلی میں ہی شائد کسی کالج میں لکچرر ہیں اور مہینے میں ایک بار اپنی بیوی سے ملنے یہاں آ جاتے ہیں ۔ آج تک کسی کو ان کا نام پتہ نہیں چل پایا ۔ لیکن محلے کے تقریباً سبھی لوگ انہیں ایل ۔ پی ۔ صاحب کے نام سے جانتے ہیں ۔ کسی نے بھی آج تک ان کی صورت ڈھنگ سے نہیں دیکھی ہوگی ۔ بھلا کیسے کوئی ان کی صورت دیکھ پائے گھر سے نکلیں تب تو ! لیکن چونکہ میں ٹھیک ان کے سامنے والے کوارٹر میں رہتا ہوں اس لئے مجھے ایک آدھ بار ان کے دیدار ہو ہی جاتے ہیں ۔

سپنا جی بڑی ہی پڑھی لکھی اور مہذب قسم کی عورت ہیں ۔ محلے کے تقریباً سبھی لوگوں سے ملتی جلتی ہیں اور ہر طرح کے عام جلسوں میں شرکت بھی کرتی ہیں ۔ بچوں کی استانی ہونے کی وجہ سے محلے کی تقریباً سبھی خواتین انہیں جانتی ہیں ۔ لیکن آج تک کسی کو بھی یہ پتہ نہیں چل پایا کہ یہ آخر کسی بھی جلسے میں اپنے شوہر کو

ساتھ لے کر کیوں نہیں جاتیں۔ ہوسکتا ہے ان کے شوہر بہت ہی سنجیدہ وشرمیلے انسان ہوں۔ لیکن یہ بھی بڑا حیران کن لگتا ہے کہ سپنا جی جیسی شوخ وترقی یافتہ عورت کا شوہر سنجیدہ وشرمیلا ہو۔

میں ایل۔ پی۔ صاحب کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں بیگم نے لنچ تیار ہونے کی اطلاع دی۔ نیچے ''ڈائننگ ٹیبل'' پر بھی ایل۔ پی۔ صاحب کی چرچا ہوگئی۔ میں نے اپنی بیگم سے پوچھا'۔

''سنو! یہ ایل۔ پی۔ صاحب ایک تو مہینے میں ایک ہی بار آتے ہیں اور وہ بھی دن بھر کمرے میں ہی بند رہتے ہیں۔ کیا انہیں کہیں گھومنے پھرنے کا جی نہیں کرتا۔؟

''آخر پروفیسر ٹھہرے۔ ہوسکتا ہے کمرے میں بیٹھ کر کچھ پڑھنے لکھنے کا سنجیدہ سا کام کرتے ہوں تمہاری طرح وہ خالی تھوڑے ہی ہوں گے۔''

''تم پھر مجھے طعنے مار رہی ہو!''

''طعنے نہیں مار رہی ہوں بلکہ سچ کہہ رہی ہوں۔ سبھی مرد تمہاری طرح نٹھلے نہیں ہوتے! ذرا ایل۔ پی۔ صاحب کو دیکھو' دن بھر کس قدر شریف انسان کی طرح بند کمرے میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں' اور ایک تم ہو جو دن بھر چھت پر بیٹھ کر ادھر سے ادھر آنکھیں۔۔۔''

''اچھا ٹھیک ہے' ٹھیک ہے!'' میں نے سوچا بات کہیں بڑھ نہ جائے اس

بدچلن

لئے یہیں پرہتھیار ڈال دیئے۔لیکن اس ایل۔پی۔صاحب سے ملنے کی خواہش بڑھتی چلی گئی۔سوچا جب کل سپنا جی اسکول چلی جائیں گی تبھی ان سے ملنے جاؤں گا اور ان کی عظمت سے کچھ تحریک حاصل کروں گا۔

دوسرے دن ڈیڑھ بجے دوپہر کا کھانا کھا کر میں ایل۔پی۔صاحب سے ملنے چلا گیا۔دروازے پر دھیرے سے دستک دی۔کئی بار کھٹکھٹانے کے بعد دروازے کے پیچھے تھوڑی حرکت ہوئی۔دروازہ کھلنے پر ایک بڑا ہی ڈرا سہما سا چہرہ نظر آیا۔

''جی میں رتی کانت چترویدی آپ کے سامنے کے کوارٹر میں رہتا ہوں۔پیشے سے افسانہ نگار ہوں اور ایک مقامی رسالے کا مدیر ہوں۔آپ شائد سپنا جی کے۔۔۔''

''تشریف لایئے'' بہت ہی مہذب و پرخلوص لہجے میں انہوں نے اندر بلایا اور پھر اپنا تعارف پیش کیا۔

''جی،میں سلیل چودھری دہلی کے ایک کالج میں انگریزی ادب کا استاد ہوں اور یہاں آپ کی سپنا جی کا پرمانٹ کرایہ دار''۔

'' آپ کو کئی بار چھت پر سے دیکھا' آپ سے ملنے کی بڑی خواہش تھی۔آج سوچا کہ آپ سے مل ہی لوں۔آپ سے مل کر اپنی معلومات میں کچھ اضافہ کرنے چلا آیا۔ویسے میری بیگم صاحبہ کے بھی آپ کے متعلق بہت ہی عمدہ خیالات ہیں

۔سمجھ لیجئے کہ آپ کی فین ہیں!''

''وہ کیسے؟''

''جی وہ کہتی ہیں کہ شوہر ہوتو ایل۔پی۔صاحب جیسا۔کس طرح وہ شریف کی طرح بند کمرے میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں کبھی باہر نہیں نکلتے۔''

''جی یہ تو ان کی ذرہ نوازی ہے۔''اور یہ کہہ کر ان کے چہرے پر ایک پھیکی مسکان تیر گئی۔

لیکن اس تعارف سے لگا کہ انہیں کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ میں نے اس موضوع پر ان سے کچھ اور کہلوانے کے لئے انہیں اور بھی گدگدایا۔

''اچھا یہ بتایئے پروفیسر صاحب' ایک صحت مند ذہن کے لئے باہر کی کھلی ہوا ضروری نہیں' ایک سماجی و مہذب انسان کے لئے دو چار لمحے اپنے پڑوسی اور دوستوں کے درمیان بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔؟''

یہ سنتے ہی پروفیسر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں نے ان کی کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔بتیس سال کا یہ نوجوان پروفیسر رونے لگے گا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔میں نے تھوڑی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

''پروفیسر صاحب! میں نے آپ کو خوامخواہ پریشان کیا' معافی چاہتا ہوں۔ لیکن میں آپ کا پڑوسی ہوں۔لکھنا پڑھنا میرا مشغلہ ہے۔اور آپ بھی زبان و ادب کے پروفیسر نکلے۔سوچا آپ کے ساتھ خوب نبھے گی۔ لہذا تعارف

بڑ ھ مانے چلا آیا۔اب چلتا ہوں۔پھر کبھی حاضر ہوں گا۔''

یہ کہہ کر میں جیسے ہی چلنے کے لئے اٹھا کہ پروفیسر نے میری بانہہ پکڑ لی۔جب ان کے آنسوؤں کا ریلہ کچھ تھما تب دھیرے دھیرے انھوں نے اپنی داستان غم سنائی۔

''رتی کانت جی!میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں آپ سے کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔''

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔پروفیسر صاحب!کھل کر کہئے' آخر میں آپ کا دوست ہوں!''میں نے ان کی جھجھک دور کرنے کی کوشش کی۔

''میرا نام سلل ہے۔آپ مجھے بار بار پروفیسر مت کہئے۔مجھے کوئی پروفیسر کہتا ہے تو مجھے اور بھی شرم آتی ہے۔''

''لیکن اس میں شرم کی کیا بات ہے!آخر آپ ایک استاد ہیں اور آپ کی بیوی ایک استانی۔میں تو خود کو بڑا خوش قسمت مانتا ہوں کہ آپ جیسے اور سپنا جی جیسے لوگ میرے پڑوسی ہیں۔

''نہیں چترویدی جی!ایسی بات نہیں ہے۔اس جہان فانی میں جو چیز جس شکل میں نظر آتی ہے وہ ویسی ہوتی نہیں۔آپ نہیں جانتے کہ میں اپنی سپنا سے کس قدر پیار کرتا ہوں۔ایک لمحہ بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔دہلی میں اس کے ساتھ پڑھتا تھا۔اور پہلی ہی نظر میں اس کا ہو کر رہ گیا۔آج تک کسی اور کے

متعلق سوچا بھی نہیں ۔اور آج وہی سپنا شادی ہو جانے کے بعد مجھے دو ڈھائی گھنٹے سے زیادہ نہیں جھیل سکتی ۔بات بات پر برا بھلا کہنے لگتی ہے' جھلانے لگتی ہے۔''

یہ کہہ کر پروفیسر تھوڑا رکا۔شائد لگاتار بولنے سے اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔میں نے پیار سے ان کی ہتھیلی اپنی ہتھیلی میں لے کر انہیں تھوڑا دلاسا دیا۔ پھر انہوں نے کہنا شروع کیا۔''آپ جانتے ہیں میں مہینے میں ایک ہی بار یہاں کیوں آتا ہوں؟

''مشکل سے ڈھائی تین گھنٹے ساتھ گذریں گے کہ ڈانٹنا شروع کر دیگی۔ بات بات پر ٹوکنا شروع کر دے گی ۔مثلاً تمہیں ٹھیک سے چلنا نہیں آتا ۔اتنی زور زور سے مت ہنسا کرو۔ناک میں انگلیاں مت ڈالو۔کرسی پر بیٹھ کر ٹانگیں کیوں ہلاتے ہو' کھانے کے وقت چپر چپر کی آواز نہ کرو' چائے کو سوسو کر کے مت پیو وغیرہ وغیرہ کہتے کہتے تنگ کر دیتی ہے۔اور میں تنگ آ کر کبھی کبھی تو اسی رات دو تین گھنٹے میں ہی واپس چلا جاتا ہوں۔''

یہ کہہ کر پروفیسر پھوٹ کر رونے لگا۔میں نے بغل کے پلنگ سے ان کا تولیہ اٹھا کر آنسو پونچھنے کے لئے دیا۔پھر پروفیسر آنسو پونچھ کر تھوڑا نارمل ہوا تو میں نے پوچھا۔

''اچھا سلل بھائی! آپ دہلی میں کھانا وغیرہ کہاں کھاتے ہیں؟''

''ایک نوکر رکھ لیا ہے' وہ صبح شام کچھ روکھا سوکھا بنا لیتا ہے۔ کبھی کبھی ہوٹل سے ہی کچھ منگوا لیتا ہوں۔''

''اور اس کے بعد۔۔۔؟''

''اس کے بعد کیا! بس کتابوں سے دوستی کر لی ہے۔ اب تو یہی کتابیں میری شریک حیات ہیں۔ میرے جنازے کے ساتھ یہ بھی جائیں گی۔''

اور اس کے ساتھ پروفیسر ایک پھیکی ہنسی ہنسا۔ مجھے لگا کہ میری ہمدردی کے خزانے میں جتنی بھی ہمدردی باقی ہے وہ اس پروفیسر کے لئے کم ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ پروفیسر اول درجے کا بے وقوف انسان ہے۔ اسے پوری دنیا میں شادی کرنے کے لئے یہی ایک مغرور ماسٹرنی ملی تھی۔

''اچھا سلل بھائی! آپ اسمارٹ ہیں میٹھا بولتے ہیں' اور عالم بھی ہیں۔ پھر بھی سپنا جی آخر آپ کو اس قدر ذلیل کیوں کرتی ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ آپ کو اتنی محبت نہیں کر پاتیں جتنی کی آپ امید رکھتے ہیں؟''

''وجہ کیا! میں ایک گاؤں میں پیدا ہوا ہوں۔ شہر کے لٹکے جھٹکے نہیں جانتا۔ سپنا کو ضرورت تھی ایک ماڈرن اسمارٹ جینٹل مین کی۔ اور مل گیا اسے میرے جیسا دیہاتی۔ آپ کو پتہ ہے' لوگ مجھے ایل۔ پی۔ صاحب کیوں کہتے ہیں ایل۔ پی کا فل فارم کیا ہے؟''

''نہیں!''

''ایل۔ پی کا فل فارم ہے للو پرساد!'' اس کے بعد ایک ٹھنڈی سانس لینے کے بعد پروفیسر نے کہا،''اور ایک میں ہوں کہ اسے دیکھے بغیر جی نہیں سکتا۔ اپنی خودداری کو طاق میں رکھ کر چلا آتا ہوں مہینے میں ایک بار اسے دیکھنے اور دوسرے ہی دن لوٹ جاتا ہوں، اپنی خشک دنیا میں۔ سمجھ لیجئے' ایک پارٹ ٹائم ہسبینڈ بن کر رہ گیا ہوں۔''

یہ کہہ کر پروفیسر نے سر پکڑ کر اپنی گردن جھکا لی۔ میں سمجھ نہیں پایا کہ پروفیسر کی حالت کا کیونکر تبصرہ کروں۔ صدیوں سے یہی سنتا چلا آرہا ہوں کہ مرد خواتین پر ظلم کرتے رہے ہیں۔ یہ عورتوں کو اپنے پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں' لیکن یہاں تو صورت حال بالکل الٹی ہے۔ یہاں تو پروفیسر کی حالت پاؤں کی جوتی سے بھی بدتر ہے۔ ہوائی چپل سمجھ لیجئے۔ کیونکہ جوتی تو پیار سے پاؤں میں چپکی رہتی ہے۔ اسے پہن کر لوگ باہر نکلتے ہیں' لیکن ہوائی چپل پہن کر لوگ باہر نہیں نکلتے' اسے تو لوگ صرف گھریلو استعمال کے لئے رکھتے ہیں۔

ساڑھے تین بج چکے تھے۔ سپنا جی کے اسکول سے لوٹنے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے پروفیسر سے وداع لی اور اپنی چھت کی جانب ہولیا۔

طوفان

بڑودا شہر کے مہاراجہ سیا جی راؤ یونیورسٹی میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا آج آخری دن تھا ۔ ملک کے تقریباً سبھی شہروں سے ڈیلگیٹس تشریف لائے تھے ۔ تین دن پہلے میں بھی راجدھانی ایکسپریس سے حاضر ہوا تھا ۔ میرے ساتھ کئی اور ڈیلگیٹس بھی ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے ۔ ان میں سے ایک تھے ڈاکٹر وملندو چکرورتی ۔ وہ کولکاتا سے تشریف لائے تھے ۔ انہوں نے انتظامیہ

سے میرے ساتھ ہی ٹھہرنے کی درخواست کی ۔ لہذا ہم دونوں کے لئے یونیورسٹی کے ایک ہی ہاسٹل کے ایک ہی کمرے میں ٹھہرنے کا انتظام ہو گیا۔ دوپہر میں نہا کر پھر ہاسٹل کے میس میں ہی کھانا کھایا۔ اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔ شام کے پانچ بجے ڈاکٹر چکرورتی کے ساتھ ہی گھومنے نکلا۔ گھومتے گھومتے ہم دونوں قریب کے ایک باغ میں جا پہنچے ۔ راستے میں کولکاتا سے ہی آئے۔ چکرورتی جی کے کچھ جاننے والے ڈیلیگیٹس مل گئے۔ انہوں نے پھر مجھے ان سبھوں سے ملوایا۔

''یہ مدھوپ چترویدی ہیں، نینی تال سے، میرے ہی ساتھ ٹھہرے ہیں۔''

اور اس کے بعد پھر چکرورتی دیگر لوگوں سے میرا تعارف کروانے ہی لگے تھے کہ ان میں سے ایک چنچل وشوخ حسینہ باہر نکل کر آئی اور خود ہی اپنا تعارف کروایا،

''میں واٹکا چٹرجی ہوں کولکاتا سے''

''واٹکا۔۔۔! یہ تو اچھا نام ہے!'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''جی ہاں میں واٹکا اور آپ مدھوپ یعنی باغ اور بھنورا، کیا خوبصورت اتفاق ہے، ہے نہ؟'' وہ حسینہ مجھ پر نچھاور ہو جانے والے انداز میں بولی۔

''ہاں اور کیا!'' میں بھی حیران رہ گیا تھا اس اتفاق سے۔ اور اس طرح میں اپنی خوشی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے واپس آ گیا تھا۔ رات میں اس حسینہ کے متعلق کافی سوچتا رہا۔ چکرورتی جی نے بتایا کہ کولکاتا کے ایک کالج میں

واٹکا بنگلا ادب پڑھاتی ہے۔ وہ شاید پہلی بار اورینٹل کانفرنس میں آئی ہے۔ اس کے متعلق میری دلچسپی کو دیکھ کر چکرورتی نے چھیڑا بھی، کیا بات ہے چترویدی، کیا اس حسینہ پر دل آ گیا؟''

''ارے نہیں یار، بس یوں ہی پوچھ رہا تھا۔'' میں نے اپنے دل کی بات چھپاتے ہوئے کہی۔

''کوئی بات ہو تو بتاؤ میں بات کرتا ہوں!''

''نہیں یار! چلو کل ناشتہ پر ملتے ہیں! گڈ نائٹ!'' اور میں نے چکرورتی کو سونے کی اجازت دے دی تھی۔ اسے سونے کی جلدی تھی۔ پر میری آنکھوں میں نیند کہاں تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ بغل کے بستر سے چکرورتی جی کے خرّاٹے کی آواز آ رہی تھی۔ لیکن رات کے دو بجے تک میں واٹکا کے خیالوں میں گرفتار رہا۔

صبح ۷ر بجے چکرورتی نے مجھے جگایا۔ پھر منہ ہاتھ دھوکر ۸ر بجے تک پوری طرح سے تیار ہوا اور پھر ناشتہ کے لئے پنڈال کی جانب بڑھا۔ ناشتہ میں صوبۂ گجرات کی بہت سی خاص چیزیں موجود تھیں۔ ان میں سے بیشتر چیزیں مجھے اچھی نہیں لگیں۔ میں بغیر پسندیدگی کے بھی کئی چیزیں کھا رہا تھا۔ کیوں کہ مجھے کسی کا انتظار تھا۔ ویسے تھوڑی دیر کے لئے واٹکا دکھی بھی لیکن وہ اپنی کسی سہیلی سے گفتگو میں مصروف تھی۔ لہذا میں نے اسے اس وقت ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔

رات میں پھر کھانا کھایا اور چکرورتی جی کے ساتھ واپس کمرے میں آ گیا۔ آج واٹکا سے ملاقات بالکل نہیں ہوئی۔ اسی درمیان سندیپ آ گیا۔ وہ دہلی یونیورسٹی کے قیام کے زمانے سے ہی میرا دوست ہے۔ اسے پھر چکرورتی سے ملوایا۔ چکرورتی ویسے مزاج سے ہی بہت ہنس مکھ انسان ہے۔ پھر دونوں کے درمیان رات کے ایک بجے تک لطیفوں کا دور چلتا رہا۔ لیکن مجھے ان دونوں کے لطیفوں میں کوئی خاص مزہ نہیں آ رہا تھا۔ میرا تو وہاں صرف جسم مقیم تھا دل تو ابھی بھی واٹکا میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ یہ دونوں میری ذہنی حالت سے بالکل بے خبر تھے۔

کانفرنس کا آخری دن بھی آ گیا۔ مہاراجہ سیا جی راؤ یونیورسٹی کیمپس میں بنے شامیانے میں پھر ایک بار ہم لوگ حاضر ہوئے۔ زیادہ تر مقررین کو ہم لوگ پہلے ہی کئی بار سن چکے تھے۔ لہٰذا ان کی باتوں میں ویسے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ آدھے گھنٹے میں ہی زیادہ تر سامعین بور ہو چکے تھے۔ آدھا شامیانہ خالی ہو چکا تھا۔ میں بھی کھسکنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا۔ میری لائن میں اب کوئی نہیں بچا تھا۔ اس لئے مجھے کھسکنا تھوڑا آسان لگا۔ اسی درمیان گلابی ساڑی میں لپٹی ہوئی ایک خوبصورت سی خاتون میری بغل میں آ کر بیٹھ گئی۔

''ارے مدھوپ جی، آپ نے تو مجھے پھر یاد ہی نہیں کیا۔''

''ارے واٹکا جی، آپ کہاں تھیں، آپ کو تو پھر دیکھا ہی نہیں!''

''کوئی دیکھنا چاہے تو دیکھ بھی سکتا ہے! آپ کیسے مدھوپ ہیں جو واٹکا کو دیکھ

تک نہیں رہا۔ مدھوپ تو وائکا میں ہی قیام کرتے ہیں!'' وائکا نے میری آنکھوں میں اپنی کالی کالی موٹی آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''چلئے پھر وائکا کی طرف ہی چلتے ہیں'' یہاں بہت بور ہو چکے ہیں!'' میں نے دھیرے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر وائکا چپ چاپ میرے پیچھے ہولی۔ دس پندرہ منٹوں میں ہی ہم دونوں مہاراجہ باغ میں داخل ہو چکے تھے۔ تھوڑی دیر ہم لوگ وہاں گھوم گھوم کر پھولوں کو دیکھتے رہے پھر جگہ دیکھ کر ایک خوبصورت سی جھاڑی میں بیٹھ گئے۔

''ہاں، یہاں کافی اچھا لگ رہا ہے، وہاں تو خواہ مخواہ بور ہو رہے تھے'' وائکا نے کہا۔

''میں بھی سوچ رہا تھا کہ وائکا کو وائکا میں ہی ہونا چاہیے۔ اسی لئے آپ کو یہاں لے آیا۔''

''آپ بھی تو مدھوپ ہیں بتائیے کس وائکا میں زیادہ رس ہے؟'' وائکا کی آنکھوں میں پھر سے شرارت تھی۔

''آپ اندازہ لگائیے میرا جواب کیا ہو سکتا ہے!''

''آپ کے جواب کے بارے میں بھلا میں کیسے بتا سکتی ہوں؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پھر میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے چوم لیا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ مجھ سے اس طرح

لپٹ گئی تھی جیسے کوئی بیل کسی ٹہنی پر لپٹ جاتی ہے۔اور پھر دھیرے دھیرے میرا خود پر سے اختیار ختم ہوتا چلا گیا۔

اس آدھے گھنٹے میں ہم دونوں کے درمیان جو طوفان آیا اس کا ہمیں خود بھی کوئی اندازہ نہیں رہا۔ہم دونوں اپنی کیفیت سے تب جاگے جب اچانک بجلی کی روشنی پھر سے دکھائی پڑی۔شاید کافی دیر سے بجلی گئی ہوئی تھی۔ادھر ادھر نظریں ڈالیں تو دیکھا کہ باغ بالکل خالی تھا۔وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔اتنے لمبے چوڑے باغ میں صرف میں اور واٹکا۔اور کوئی بھی نہیں۔باغ کا مین گیٹ کافی دور تھا جہاں ایک دو دربان بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ہم دونوں کے چہرے پر تھوڑی شرمندگی تھی۔ایک دوسرے سے نظریں نہیں ملا پا رہے تھے۔میں نے اسے پھر سے اپنی بانہوں میں لے کر اس کے کان میں دھیرے سے کہا، ''واٹکا! آج کیا ہوا؟''

''جو کچھ بھی ہوا سب اوپر والے کی مرضی سے ہی ہوا ہے!''

''پھر بھی۔۔۔۔۔!''

''پھر بھی کیا! کسی خوبصورت پھول کو دیکھ کر کوئی بھونرا چوکتا ہے کیا؟''

''نہیں تو!''

''پھر۔۔۔؟ تم نے وہی کیا جو تمہیں کرنا چاہئے تھا۔تم نے آج میری برسوں کی پیاس کو مٹایا ہے۔تمہارا کس طرح شکریہ ادا کروں مدھوپ!''

''ایسے!'' میں پھر اس کے رخسار پر کافی دیر تک بوسوں کی بارش کرتا رہا۔

''گیارہ بج چکے ہیں۔ ہاسٹل میں دربان انتظار کر رہا ہوگا۔'' وانکا نے گھڑی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''تھوڑی دیر تو اور بیٹھو رانی!''

''ہاسٹل کا دروازہ بند ہو جائے گا!''

''میرے دل کا دروازہ تو کھلا ہے!''

''اچھا!''

''دل کا ہی نہیں، گھر کا بھی دروازہ کھلا ہے!''

''کیا مطلب؟'' وانکا نے باہوں سے نکلتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں وانکا! اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے گھر کی مہارانی بنانا چاہتا ہوں۔''

''یہ ممکن نہیں ہے مدھوپ!''

''کیوں؟'' مجھے تھوڑی حیرت ہوئی۔

''میری شادی ہو چکی ہے۔''

''کیا؟'' میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مجھے تو خواب میں بھی اس سے اس طرح کے جواب کی امید نہ تھی۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ ایک پل میں وانکا میرے خوابوں کے محل کو چکنا چور کر دے گی۔

''ہاں مدھوپ، میری شادی آج سے ۱۸ سال پہلے ہی ہوچکی ہے۔ دو بچوں کی ماں بھی ہوں۔''

''پھر بھی تم نے۔۔۔۔۔! خیر گھر میں کون کون ہیں؟''

''ایک بیٹا، ایک بیٹی، ان کے پتا اور ان کی دادی۔ مدھوپ، میری شادی تب ہوئی تھی جب میں ۱۳ سال کی تھی۔ پتا جی بہت ہی غریب تھے۔ بیمار بھی رہتے تھے۔ ماں کا انتقال بہت پہلے ہی ہو چکا تھا۔ میں تین بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ بڑی بہن کی شادی ہوچکی تھی۔ بھائی کالج میں پڑھ رہا تھا۔ پتا جی کو بس میری شادی کی فکر تھی۔ ایک دن جب پتا جی کو دل کا دورہ پڑا تب پتا جی کے ایک دوست انہیں دیکھنے آئے تھے۔ پھر۔۔۔۔''

''پھر کیا ہوا؟'' میں سانس روک کر دانکا کی پوری داستان سن رہا تھا۔

''پھر جب وہ دورے سے ٹھیک ہوئے تو ان کے دوست نے اپنے بیٹے کے لئے میرا ہاتھ مانگ لیا۔ پھر کیا تھا پتا جی کو جیسے منہ مانگی مراد مل گئی۔ پھر دھوم دھام سے میری شادی ہوگئی۔''

''تمہارے شوہر کیا کرتے ہیں؟''

''ان کی کپڑے کی دوکان ہے۔ صبح سے شام تک وہ اپنی دوکان سے چپکے رہتے ہیں۔ صبح ۷/ بجے ہی دوکان کے لئے نکل پڑتے ہیں۔ رات میں کبھی ۹/ بجے تو کبھی ۱۰/ بجے تک گھر لوٹتے ہیں۔''

''اور بچوں کی پڑھائی وغیرہ۔۔۔۔۔۔؟''

''وہ سب میں ہی دیکھتی ہوں۔دراصل میں شروع میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔لیکن جب دیکھا کہ شوہر کو دکان کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں تو پھر میں نے بھی پڑھائی شروع کی۔میں ان دنوں صرف دسویں ہی کر کے آئی تھی۔اس کے بعد دھیرے دھیرے میں نے بنگلا ادب میں ایم۔اے۔کیا اور ایک کالج میں استانی ہوگئی۔''اور یہ کہہ کر واٹکا چلنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔رات کافی ہو چکی تھی۔ہم دونوں تیزی سے ہاسٹل کی طرف بڑھنے لگے۔جلدی ہی ہم واٹکا کے ہاسٹل کے مین گیٹ کے قریب تھے۔پھر واٹکا رک گئی تھی۔مجھے اپنی بانہوں میں لے کر دھیرے سے کان میں کہا تھا،۔''مدھوپ! اس جنم میں میں تمہاری محبوبہ ہوں۔اگلے جنم میں تمہارے گھر کو سجاؤں گی،تمہارے بچوں کی ماں بھی بنوں گی۔''اور اسی کے ساتھ اس نے پھر میرے گال پر کئی بوسے جڑ دئے اور تیزی سے ہاسٹل میں داخل ہوگئی۔میرے گال پر آنسوؤں کی کچھ بوندیں جو واٹکا کی آنکھوں سے گری تھیں اب ڈھلک کر میرے ہاتھوں پر آ گئی تھیں۔

☆

اجازت

پچھلے مہینے میرے پڑوس میں ایک نیا کنبہ رہنے کو آیا۔ سنا ہے کوئی مسٹر اگروال شہر کے کسی بینک میں منیجر ہیں۔ لکھنو سے تبادلہ ہو کر آئے ہیں۔ مکان مالک کو کیا، انہیں تو صرف پیسہ چاہئے، چاہے کوئی بھی کرایہ دار کیوں نہ آجائے۔ خیر یہ جان کر تسلی ہوئی کہ کوئی پڑھا لکھا آدمی ہی آیا ہے۔

مسٹر اگروال روز ۱۰ ربجے کے قریب اپنے دفتر کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں

بدچلن

۔ چونکہ ہم دونوں کے غسل خانے آمنے سامنے ہی ہیں لہذا ہماری ملاقات اکثر ہو ہی جاتی ہے۔ میری کلاس گیارہ بجے شروع ہوتی ہے اسلیئے میں اطمینان سے ساڑھے دس بجے تک نہادھوکر کالج کے لئے نکلتا ہوں۔

اگروال صاحب کی عمر ۴۰۔۳۸ سال کے آس پاس ہوگی، مجھ سے تین چار سال ہی زیادہ۔ ان کے گھر میں ایک ان کی اہلیہ اور ایک چھوٹی سی بچی دوڈھائی سال کی۔ ان کے بینک جانے کے بعد ان کی بیوی سارادن یا تو چاول چنتی رہتی یا آنگن صاف کرتی یا پھر سویٹر بنتی رہتی ہیں۔ ابھی یہ کنبہ نیا نیا ہی یہاں آیا ہے اس لئے ابھی سبھی پڑوسیوں سے ٹھیک سے گھلے ملے نہیں ہیں یہ لوگ۔ ہاں کبھی راستہ میں اگر اگروال صاحب سے ٹکر ہو جاتی ہے تو مسکرا کر نمستے کا تبادلہ ہو جاتا ہے۔ ابھی دوالی میں یہ جان کر کہ میں یہاں تنہا ہوں مسز اگروال رات میں ایک تھالی میں پوری سبزی اور کئی طرح کی مٹھائیاں میرے پاس رکھ گئیں۔ مجموعی طور سے یہ کنبہ مجھے کافی پسند آیا۔

آج جیسے ہی کالج گیا تو پتہ چلا کہ کالج کا ایک چپراسی بس حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ مسوری میں ویسے بھی پہاڑ سے بس الٹنے کی بات کوئی نئی تو ہے نہیں۔ لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ بچارے گنیشی لال کے تین بچے ہیں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ دو بیٹیوں میں سے ایک کی بھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ بیٹا بھی کسی نوکری یا روزگار سے نہیں لگا۔ خیر کالج میں کنڈولنس میٹنگ ہوئی اور

اس کے بعد سبھی اساتذہ اور دیگر کارکن اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے۔

اپنی رہائش کالج سے بالکل قریب ہونے کی وجہ سے پانچ منٹ میں ہی گھر واپس آ گیا تھا۔ گھر پہنچتے ہی مسٹر اگروال کے کمروں کے سامنے ایک نوجوان خاتون کو دیکھا جو شاید کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی۔ اور ساتھ میں کافی یا چائے کی چسکیاں بھی لیتی جا رہی تھی۔ مجھے تھوڑی حیرت ہوئی یہ خاتون کون ہو سکتی ہے۔ مسز اگروال تو آجکل اپنے مایکہ گئی ہوئی ہیں۔ پھر یہ نئی خاتون ۔۔۔ میں یہ سوچتے سوچتے اپنے کمرے کی جانب بڑھ ہی رہا تھا کہ اس کی ایک نگاہ میری طرف پڑی۔ پھر تو میں بھی اس طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکا اور مجھے ایسا لگا جیسے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ مجھے پھر پہچاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اچانک میری زبان سے نکلا ''اری سرتا!''

''ساگر! تم یہاں!'' اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔

''اور کیا، میں یہیں ڈگری کالج میں پڑھا رہا ہوں!''

''ہائے میری جان! تم کہاں کھو گئے تھے؟'' سرتا بری طرح سے مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ ۱۳ سال بعد ملنا ہوا تھا۔

''سرتا! کوئی آ رہا ہے!'' میں نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

''کہاں کوئی آ رہا ہے جھوٹے کہیں کے! تمہاری پرانی عادت ابھی تک گئی نہیں!''

''تمہیں پتہ نہیں ڈارلنگ! اس کالونی میں کافی جاہل لوگ قیام کرتے ہیں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو۔۔۔۔''

''تو کیا زندگی بھر ہم یوں ڈرتے ہی رہیں گے! اچھا تم بیٹھو میں تمہارے لئے کافی لاتی ہوں۔'' یہ کہتی ہوئی سرتا نے اپنی کرسی میری طرف بڑھا دی اور کافی لینے اندر چلی گئی۔ میں وہیں کرسی پر بیٹھ کر اپنے ماضی پر ایک نظر ڈالنے لگا۔

ان دنوں میں بھاگلپور ٹی۔ این۔ بی۔ کالج میں پڑھائی کر رہا تھا۔ یہ کالج صوبے کے چند مشہور کالجوں میں سے ایک تھا۔ عام طالب علموں کا داخلہ یہاں نہیں ہوتا تھا۔ یہیں پر میری ملاقات سرتا سے ہوئی تھی۔ میں کالج کے کیمپس میں ہی ویسٹ بلاک ہاسٹل میں رہتا تھا۔ یہ بات اسے کسی نے بتلا دی تھی۔ ایک دن اچانک ہاسٹل کے چپراسی نے مجھے اطلاع دی تھی کہ کوئی لڑکی آپ کو پوچھ رہی ہے۔ میں جھٹ سے کامن روم کی طرف نکلا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی انگریزی کی کلاس سے فارغ ہو کر آیا تھا۔ دیکھا تو کامن روم میں ٹیبل پر لگی میگزین کے صفحے پلٹتی ہوئی سرتا دکھائی پڑی۔

''اری سرتا جی آپ یہاں؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''کیوں، میں یہاں نہیں آ سکتی؟''

''کیوں نہیں، بیٹھیے نا!'' میں نے اسے بٹھایا تھا۔

''ساگر جی، مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ کے پاس ڈاکٹر محسن کی جنرل سائکولوجی

ہے۔ مجھے ایک دن کے لئے چاہئے تھی۔''

''ایک دن کے لئے ہی کیوں زندگی بھر کے لئے دیکھیے ! ابھی حاضر کرتا ہوں''

پھر کمرے سے ڈاکٹر محسن کی کتاب لا کر میں نے سرتا کے ہاتھوں پر رکھ دی تھی اور باہر کالج کی کینٹین میں چل کر اسے چائے پلوائی۔ اس کے بعد ہماری کلاس کا وقت ہو چلا تھا۔ کینٹین کے سامنے ہی شعبہ نفسیات کی بلڈنگ دکھائی پڑ رہی تھی۔ پھر میں نے کینٹین سے ہی سرتا کو رخصت کر دیا تھا۔ وہ دھیرے سے اپنی سہیلیوں کی جھنڈ میں شامل ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میرے کچھ دوستوں نے اسے میرے ہاسٹل میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن سے یہ احباب سرتا کا نام لے کر مجھے چھیڑنے لگے۔

دوسرے ماہ کالج میں ٹرمنل ٹیسٹ ہوا تھا۔ نتیجہ بھی دوسرے ہفتہ میں بتا دیا گیا تھا۔ شعبہ نفسیات میں جب پروفیسر ورما نے نتیجہ کا اعلان کیا تو میں حیران رہ گیا۔ میرا نام سب سے اوپر تھا اور اس کے ٹھیک بعد سرتا تھی۔ صرف دو نمبروں کا فرق تھا۔ اس بات کو لے کر بھی پورے کالج میں چرچا رہا۔'' کیا بات ہے ساگر بھائی ! اوپر والے نے بھی کیا اتفاق پیدا کیا ہے، صرف دو نمبروں سے ہی اوپر نیچے کیا ہے'' اپنے دوست رنجن گپتا نے چٹکی لی تھی۔ لیکن انگریزی میں کہتے ہیں' مین پرپوزز اینڈ گاڈ ڈسپوزز ہماری دوستی پر کسی کی بری نظر پڑ گئی۔ کسی نے

بدچلن

میرے گھر میں یہ تمام باتیں نمک مرچ لگا کر بتلا دی تھیں۔ گھر میں پھر مجھے بڑے مہابھارت کا سامنا کرنا پڑا۔ پتا جی نے غصے سے کہا تھا ''کون ہے یہ سرتا؟ تم کالج پڑھنے جاتے ہو یا عشق کرنے؟ اگر پڑھائی میں طبیعت نہیں لگتی تو کھیتی کے لئے مزدور کی بڑی قلت چل رہی ہے، کوئی ضرورت نہیں ہے کالج جانے کی۔'' اور اوپر سے سرتا کا ایک اور بھی عاشق پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک دن مجھے دھمکی بھی دی'' اگر پھر کبھی سرتا کے پاس کہیں دکھائی پڑا تو۔۔۔۔'' اس کے بعد سرتا نے کالج آنا تقریباً بند ہی کر دیا تھا۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا جب تک زندگی میں کچھ حاصل نہ کرلوں سرتا سے نہیں ملوں گا۔

بعد میں ہمارا سالانہ امتحان ہوا۔ میں نے یونیورسٹی میں تیسرا مقام حاصل کیا تھا۔ پھر میں بی۔ اے۔ کے لئے پٹنہ کالج اور اس کے بعد ایم۔اے۔ کے لئے دہلی یونیورسٹی چلا گیا تھا۔ وہیں پچھلے سال پی۔ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری جناب نائب صدر کرشن کانت جی کے ہاتھوں ملی تھی۔ اس کے بعد مسوری کے اس کالج میں تقرر ہوا تھا۔ میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ یہاں سرتا سے۔۔۔

''کافی حاضر ہے!'' سرتا نے اچانک کافی لا کر مجھے ماضی کے خوبصورت خیالوں سے جگا دیا تھا۔ کافی کے ساتھ سرتا کے ہاتھوں میں بسکٹ مٹھائی نمکین وغیرہ کی ایک بڑی پلیٹ بھی تھی۔ اس نے پیار سے ملک کیک کا ایک ٹکڑا میرے

منہ میں ڈال دیا تھا۔ اسے تو معلوم ہی تھا کہ مجھے مٹھائیاں بہت پسند ہیں۔ مجھے بھاگلپور کا آدرش جلپان گرہ پھر سے یاد ہو آیا تھا جہاں اکثر میں سرتا کو لے کر جایا کرتا تھا اور وہاں پیار سے وہ میرے منہ مین ملک کیک کا ٹکڑا ڈال دیا کرتی تھی۔

'آج شام میں بھیا آئیں گے پھر ان سے تمہارا تعارف کرواؤں گی، وہ بہت خوش ہوں گے۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''ایک دن وہ بھابھی سے کہہ رہے تھے آج اگر ساگر مل جاتا تو سرتا کے لئے لڑکا تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

''سچ؟'' مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا۔

''ہاں، میری جان!'' سرتا کے اتنا کہتے ہی میں نے پھر سے اس کا ہاتھ چوم لیا تھا۔ پھر کافی دیر تک ہماری گفتگو ہوتی رہی۔ پھر میں نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا تھا اور شام پانچ بجے تک ماضی کے خیالوں میں دونوں کھوئے رہے۔ نہ کھانے کی چاہ تھی اور نہ کھلانے کا خیال۔ اس کے بعد سرتا اپنے گھر چلی گئی۔ میں بھی منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ شام میں ٹہلنے کے لئے اکثر میں مال روڈ پر نکل جاتا ہوں۔ ابھی نکلنے ہی والا تھا کہ باہر سے آواز آئی، ارے پروفیسر صاحب، کہاں کی تیاری ہو رہی ہے؟''

''آیئے بھائی صاحب!'' باہر اگروال صاحب تھے۔ انہیں اندر بلوایا۔''

بس ایوننگ واک کے لئے نکل رہا تھا، بیٹھیے چائے پلواتا ہوں!''

''چائے تو آپ آج میرے یہاں پئیں گے، سرتا نے چائے بنا رکھی ہے! چلیئے!'' یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ سرتا نے میرا تعارف کروا دیا ہے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں اگروال صاحب کے گھر میں داخل ہوا۔ وہاں ٹیبل پر چائے اور دیگر چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ سرتا رسوئی کے اندر سے ہی مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ منہ بھی چڑھا رہی تھی۔

''پروفیسر صاحب چائے لیجئے!'' اگروال صاحب نے چائے بڑھائی۔

''جی لیتا ہوں، شکریہ!'' میں نے ہچکتے ہوئے چائے پینی شروع کی۔ اتنے میں سرتا رسوئی سے کچھ پکوڑے تل کر پلیٹ میں لیکر حاضر ہوئی۔

''چائے بنانے والی سے تعارف کروانے کی ضرورت تو نہیں؟''

''جی۔۔۔!'' میں ہکلاتا ہوا صرف اتنا ہی کہہ پایا۔ سرتا بھی شرماتی ہوئی اندر رسوئی میں گھس گئی تھی۔ اور پھر اندر سے ہی مجھے دیکھ کر منہ چڑھاتی رہی۔ میں دھیرے دھیرے چائے پیتا رہا۔ اگروال صاحب کچھ کاغذات کو دیکھ کر ان پر دستخط بھی کرتے جا رہے تھے اور چائے بھی پیتے جا رہے تھے۔ جلد ہی ہماری چائے ختم ہو چکی تھی۔ اگروال صاحب بھی اپنے کام کے ساتھ ساتھ چائے ختم کر چکے تھے۔

''بھائی صاحب چائے کا بہت بہت شکریہ!'' میں نے تکلف سے کام لینے

اجازت

کی کوشش کی۔

''بھئی چائے کا شکریہ تو چائے بنانے والی کا کیجئے۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا ہے۔''

''جی۔۔۔!اب اجازت دیجئے!''

''کدھر جارہے ہیں!؟''

''جی مال روڈ کی طرف۔۔۔۔!''

''بھئی مال روڈ اور اکیلے۔۔۔۔؟''

''جی آپ بھی چلئے۔۔۔۔!''

''جی نہیں، میں نے مال روڈ دیکھ رکھا ہے آج آپ اپنی چائے بنانے والی کو لے جایئے۔انہوں نے مال روڈ نہیں دیکھا ہے۔ میں تو ذرا بس اسٹنڈ کو جا رہا ہوں۔میرے ایک دوست دہلی سے تشریف لا رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر اگروال صاحب پکچر پیلیس بس اسٹینڈ کی طرف نکل گئے۔اور میں رسوئی میں جا کر اپنی سرتا کے رخسار پر۔۔۔۔۔''یہ کیا کر رہے ہو؟ کوئی دیکھ لے گا۔''

''اب کسے دیکھنا ہے، بھیا تو گئے۔اور انہوں نے بھی تو اب اجازت دے دی ہے''۔اور پھر ہم دونوں لپٹ گئے تھے۔آج مال روڈ پہلے سے کہیں زیادہ حسین دکھ رہا تھا۔

بدچلن

انعام

پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری کی عمارت بہت ہی خوبصورت ہے اس میں کوئی شک نہیں ۔ یہ چار منزلہ عمارت دور ہی سے لوگوں کا دھیان اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔اس کے ٹھیک سامنے ہے کیمیکل انجنئر نگ کی بہت ہی لمبی چوڑی بلڈنگ ۔جس میں سب سے اوپری منزل میں شعبہ اردو ہے' یہاں میرے دوست ڈاکٹر رحمٰن اکثر شام کو بھی کلاس لیتے رہتے ہیں ۔ کتب خانے

کے پیچھے یونیورسٹی کا کافی ہاؤس ہے جس میں طلباء اپنی اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ کافی پیتے دیکھے جاتے ہیں اور آج اسی کافی ہاؤس کی زینت میں تب چار چاند لگ گئے جب میں شام کو وہاں نشا کے ساتھ داخل ہوا۔

دراصل پنجاب یونیورسٹی کے اکیڈمک اسٹاف کالج میں اورینٹیشن پروگرام میں تقریباً ۳۲ افراد شرکت کر رہے تھے۔ یہ تمام افراد دیگر کالجوں سے آئے ہوئے تھے۔ ان تمام لوگوں میں میرے ساتھ نشا بھی تھی جو پٹیالہ سے آئی تھی۔ در حقیقت دن بھر کے تھکا دینے والے لکچروں سے سبھی لوگ پریشان تھے۔ صبح ۹ بجے سے شام کے ساڑھے پانچ بجے تک کی کسرت سے ہم لوگ واقعی بہت تھک جاتے تھے اور اس تھکن کو مٹانے کا ایک ہی ذریعہ تھا جو نشا کا خوبصورت چہرہ تھا۔ چھوٹا قد، گلابی ہونٹ اور چہرے پر ہمیشہ رہنے والی مسکان نہ جانے کتنوں کی جان لے چکے ہوں گے۔

ہماری پہلی ملاقات تب ہوئی جب پہلے ہی دن پروفیسر موہن نے اپنے آئس بریکنگ سیشن میں ہم دونوں کو ایک ہی گروپ میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس آئس بریکنگ سیشن میں نہ جانے اس نے کتنی برف توڑی لیکن میں تو پورے دس منٹ تک اس کا سراپا ہی دیکھتا رہا۔ مجھے پتہ نہیں کہ اس نے کیا کیا پوچھا اور میں نے کیا جواب دیا۔ بس جلدی سے میں نے اپنے کالج میں اپنے ساتھ پیش آنے والے ایک حادثے کی روداد سنا دی تھی اور پھر اسی وقت پروفیسر موہن نے ہمیں

بلا لیا تھا۔ شاید وقت ختم ہو گیا تھا۔

اس دن لنچ کے بعد میری اور نشا کی سیٹ قریب ہی تھی۔ ابھی لکچر میں تھوڑی دیر تھی۔ میں بھی آرام سے بیٹھا رحمٰن بھائی کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ شاید نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے۔

نشا نے پوچھا: ''کیا آپ نے پی ایچ۔ ڈی۔ کر لی ہے؟''

''ہاں جی! کیوں، کوئی خاص بات۔۔۔؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، میری ابھی نہیں ہو پائی ہے!'' نشا نے بھولے پن سے کہا۔

''کیوں؟''

''دراصل پچھلے سال میری شادی ہو گئی، اور پھر کالج میں رسرچ کا ماحول بھی نہیں ہے۔'' نشا نے وجہ بتائی۔

''خیر، اب کیا ارادے ہیں؟''

''دوا کر جی! اگر آپ تھوڑی مدد کر دیں تو میری پی ایچ۔ ڈی۔ بھی جلد ہی مکمل ہو جائے۔''

پتہ نہیں میرا نام اسے کیسے معلوم ہوا۔ شاید پروفیسر موہن سے تعارف کے وقت میرا نام اس نے سن لیا ہو یا سامنے میز پر رکھی فائل پر لکھا ہوا میرا نام اس نے پڑھ لیا ہو۔

''ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں! لیکن آپ تو کامرس میں ہیں اور میں ٹھہرا زبان و

ادب کا آدمی! میں بھلا کیسے آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟''

''دوا کر جی! میرا ابھی پی ایچ۔ڈی۔ میں رجسٹریشن بھی نہیں ہوا ہے آپ کم از کم اتنا تو بتا ہی سکتے ہیں کہ پی ایچ۔ڈی میں رجسٹریشن کے لیے سناپسس کیسے بنایا جاتا ہے۔''

''جی! بالکل بتا سکتا ہوں۔''

''تو یہ کام آج سے ہی کیوں نہ شروع کریں؟''

''جی۔آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔آپ جیسا کہیں گی ویسا ہی ہوگا۔''

''تو آج شام ساڑھے پانچ بجے سیدھے لائبریری ساتھ ہی چلتے ہیں، ٹھیک ہے؟''

''جی ہاں، بالکل۔''!

شام کے ساڑھے پانچ بجے جب لکچر ختم ہوا تب نشا کے ساتھ میں لائبریری کی جانب چل پڑا۔ وہاں ریفرنس سیکشن میں کچھ تھیسس نکال کر دونوں نے دیکھے، پھر سپر وائزر کے بتائے ہوئے موضوع پر نظر ڈالی اور تھیسس کا عنوان قائم کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ یہ سلسلہ کئی روز جاری رہا۔تقریباً سات بجے تک ہم دونوں یہ کام انجام دیتے اور اس کے بعد نشا اسکوٹر سے اپنے گھر چلی جاتی۔شاید اس کا مائکہ یہیں چنڈی گڑھ میں ہی کہیں ہے۔اس کے جانے کے بعد میں دو چار اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالتا اور پھر رحمٰن بھائی سے ملنے ان کے

شعبے میں چلا جاتا جہاں سے ہم دونوں ساتھ ہی نکلتے ۔آ جکل میں رحمٰن بھائی کے یہاں ہی ٹھہرا ہوا ہوں ۔ رحمٰن بھائی دہلی یونیورسٹی کے دنوں سے ہی میرے دوست ہیں ۔انھیں کی دعوت پر میں اورنٹیشن پروگرام کے لیے پنجاب یونیورسٹی آیا ہوں۔

آج اورنٹیشن پروگرام کا آخری دن تھا۔ گیارہ بجے اس کا اختتام ہونے والا تھا۔مہمان خصوصی نے شرکاءکوسرٹیفکٹس دیے اور پھر تقریریں اور ثقافتی پروگرام بھی ہوئے ۔لنچ بھی ہم سب نے ساتھ ہی لیا۔

لنچ کے بعد میں پی ۔کے۔ سنگھ کے اسکوٹر پر ان کے شعبہ کی طرف روانہ ہو گیا ۔پی ۔کے ۔سنگھ بھی دہلی یونیورسٹی کے دنوں سے ہی میرے دوست ہیں ۔ان کے شعبہ میں پھر چائے کا ایک دور چلا۔اسی دوران ان کے ایک دوست ان سے ملنے آئے اور وہ ان سے گفتگو میں مصروف ہو گئے ۔ میں وہاں بیٹھا نشا کے متعلق سوچتا رہا۔۔۔آج تو اورنٹیشن پروگرام کا آخری دن تھا۔آج کے بعد نشا کے ساتھ گزری ہوئی حسین شامیں کہاں میسر ہوں گی ۔کاش یہ اورنٹیشن پروگرام ہماری زندگی میں ہمیشہ کے لیے شامل ہو جاتا!انھیں خیالوں میں گم تھا کہ وہاں دیوار پر لگی گھڑی نے ساڑھے چار بجنے کا اعلان کیا ۔ میں پی ۔کے۔ سنگھ صاحب سے معذرت کر کے کتب خانے کی طرف روانہ ہو گیا۔فرسٹ فلور پر جا کر کچھ رسالے دیکھنے لگا۔رسالوں میں طبیعت لگ نہیں رہی تھی ۔پھر نو بھارت

انعام

ٹائمس کی سرخیوں پر ایک نظر ڈالی۔اسی درمیان پشت سے آواز آئی۔

''دواکر جی!''

''ارے نشا جی! آپ کب آئیں؟''

''حضور پورے پانچ منٹ سے آپ کے پیچھے کھڑی ہوں اور آپ ہیں کہ میری طرف دیکھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔!''

''نہیں۔ایسی بات نہیں ہے۔''

''جناب! آج کے بعد پریشان نہیں کروں گی' ٹھیک ہے۔؟''نشا نے قتل کرنے والے انداز میں کہا۔میرے دل میں تو آیا کہ کہہ دوں کہ۔۔۔''نشا جی۔ آپ زندگی بھر مجھے پریشان کیجیے۔''لیکن کاش! میں کہہ پاتا۔

پھر وہاں سے ہم دونوں ریفرنس سکشن کی طرف بڑھ گئے۔نشا کی سناپسس تقریباً تیار ہو چکی تھی۔آج صرف اس پر نظر ثانی کرنی تھی۔تقریباً آدھے گھنٹے میں پوری سناپسس کا ڈرافٹ ہم نے دیکھ لیا۔املے کی دو ایک غلطیوں کے علاوہ سب درست ہی تھا۔

''جی بالکل ٹھیک ہے! آپ جیسی ذہین محقق سے بھلا کیسے غلطی ہو سکتی ہے؟''

''سچ؟''نشا کی آنکھوں میں تھوڑی سی حیرانی تھی۔

''اور کیا۔''میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

''دواکر جی! آج آپ نے پتہ ہے کتنا بڑا کام نپٹا دیا ہے؟''

''کتنا بڑا؟'' میں نے بھی اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''بہت بڑا۔ ورنہ مجھ سے تو پی ایچ۔ ڈی۔ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ پتہ نہیں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟''

''شکریہ تو ادا کر سکتی ہیں۔!''

''کیسے۔؟'' نشا کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔

''ایک کپ کافی پلا کر!''

''ارے دواکر جی، آپ بھی۔۔۔! چلیے ابھی پلاتی ہوں!''

اسی کے ساتھ ہم دونوں اٹھ لیے اور کتب خانے کے عقب میں واقع کافی ہاؤس میں داخل ہوئے۔ اور وہاں ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ بیرے کو نشا ہی نے اشارہ کیا۔

''ہاں دواکر جی! کافی کے ساتھ اور کیا کیا لیں گے؟''

''بس کافی ہی کافی ہے۔''!

''نہیں کچھ تو لینا ہی پڑے گا۔''!

''آج تو آپ زہر بھی پلا دیں تو چلے گا۔''

''کیسی اُشبھ اُشبھ سی باتیں کر رہے ہیں۔ آج آپ کو کیا ہو گیا ہے؟''

''دو پلیٹ ہاٹ ڈاگ کے ساتھ دو کافی لے آؤ۔'' نشا نے بیرے سے کہا۔

بیرا آرڈر لے کر چلا گیا اور میری نظریں نشا کے رخسار پر ٹک گئیں۔

''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' نشا نے دھیرے سے کہا۔

''دیکھ رہا ہوں اس چاند کے ٹکڑے کو، جو کل سے دیکھنے کو نہیں ملے گا۔''

''ارے دواکر جی! آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں اتنی خوبصورت کہاں ہوں!'' نشا نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''بھئی، گلاب کو کیا پتہ کہ وہ کتنا خوبصورت ہے! یہ تو دیکھنے والا ہی بتا سکتا ہے کہ وہ کتنا حسین ہے، اس میں کتنی خوشبو ہے۔''

''دواکر جی۔۔۔!'' نشا کے انکار میں بھی ایک اقرار جھلک رہا تھا۔ کبھی بھی کوئی حسینہ اپنے حسن کی تعریف کو قبول نہیں کرتی لیکن اس کی ''نہ'' میں بھی ''ہاں'' صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

''دواکر جی، آپ تو ادب کے استاد ہیں۔ حسن اور خوشبو کے متعلق آپ زیادہ بتا سکتے ہیں۔ میں ٹھہری کامرس کی اسٹوڈنٹ! میں اتنی گہرائی میں کہاں جا سکتی ہوں۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ اگر اس اورنٹیشن پروگرام میں آپ نہ ہوتے تو میری پی ایچ۔ ڈی۔ کا کیا ہوتا! سچ میں آپ نے میری سناپسس بنا کر بہت بڑا کام کیا ہے۔''

''بہت بڑا کام؟''

''جی بالکل''

''لیکن آپ نے کوئی انعام تو دیا ہی نہیں!'' میں نے نشا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''کیا انعام چاہتے ہیں؟'' نشا کی آنکھیں شرم سے جھک گئی تھیں۔

''جو بھی آپ دے دیں!''

''میرے پاس اب دینے کو ہے ہی کیا دوا کر جی! سارے انعامات تو پہلے ہی کسی کو دے چکی ہوں! اب آپ کو کیا دوں؟'' یہ کہتے ہوئے نشا نے ہاٹ ڈاگ کا ایک لقمہ میرے منہ میں ڈال دیا۔

''کہیے' کیا انعام دوں۔؟'' نشا نے کہا۔

''نشا جی' انعام تو مل گیا۔!''

''وہ کیسے۔؟!'' نشا تھوڑی حیران ہوئی۔ لیکن کچھ ہی لمحوں کے بعد اس کے چہرے پر مسکان تھی اور رخسار شرم سے لال۔

''سر! اور کچھ چاہیے؟'' یہ بیرے کی آواز تھی۔

''نہیں۔ بس بل لے آؤ۔'' اس سے پہلے کہ نشا کچھ کہتی یا مجھ سے کچھ اور لینے کا اصرار کرتی' میں نے بیرے کو بل لانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ بل نشا ہی نے ادا کیا۔ اور پھر ہم کافی ہاؤس سے باہر نکل آئے۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ٹھنڈ کافی بڑھی ہوئی تھی اس لیے نشا نے اپنا اوورکوٹ نکال لیا تھا۔

''ہائے' آٹھ بج گئے ہیں۔''نشا نے گھڑی دیکھی۔

''ہاں جی! آٹھ بج گئے ہیں!''میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اچھا دواکر جی۔آپ سے ہونے والی ملاقاتوں کو بھلا پانا مشکل ہوگا کبھی پٹیالہ آیئے۔وہاں آپ کو اپنے ہاتھ کا بنا ہوا ڈوسہ کھلاؤں گی۔''

''ہاں ڈوسہ تو مجھے بہت ہی اچھا لگتا ہے' اب پٹیالہ آنا ہی پڑے گا۔''

''اچھا تو پھر اجازت ہے؟''

''جی تو نہیں کرتا کہ ہاں کہوں!''

''او دواکر جی۔۔۔۔! آپ بھی۔۔۔۔!''اور اس طرح جان لے لینے والی ادا کے ساتھ دیکھتے ہوئے نشا نے اپنا اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور ہاتھ ہلاتی ہوئی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

میں بھی کافی دیر تک یوں ہی ہوا میں ہاتھ ہلاتا رہا۔پھر رحمٰن بھائی کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑا۔وہاں پی۔کے۔سنگھ اور ایل۔کے۔شرما بھی موجود تھے۔

''کیا بات ہے دواکر جی' آج بہت دیر ہوگئی۔؟''رحمٰن بھائی نے پوچھا۔

''لگتا ہے لائبریری کی تمام کتابیں پڑھ کر آئے ہیں۔''؟ شرما جی نے چٹکی

لی۔

''لیجیے اب چقندر کا سوپ پیجیے۔ رحمٰن بھائی نے بڑی محبت سے آپ کے لیے بنایا ہے۔'' پی۔ کے۔ سنگھ بھی کب پیچھے رہنے والے تھے۔

''شکریہ رحمٰن بھائی!'' میں نے دھیرے دھیرے سارا سوپ ختم کیا۔ لیکن انھیں کیا پتہ کہ جس سوپ کا مزا آج میں نے کافی ہاؤس میں لیا ہے وہ اس چقندر کے سوپ میں کہاں؟

انعام

حیران

آج برہم پتر میل تھوڑی دیر سے بھاگلپور پہنچی۔ رات کے آٹھ بج گئے تھے۔ اس وقت سچترا سے ملاقات نہیں ہو سکتی تھی کیوں کہ اس کے ہاسٹل میں وزیٹنگ آور صرف شام سات بجے تک ہی ہوتا ہے۔ خیر ہاسٹل کے پاس ہی ایک ہوٹل میں رکنے کا فیصلہ کیا۔ چوں کہ دوسرے دن اتوار تھا لہذا اس دن، دن بھر ملنے کی آزادی رہتی ہے۔ اتنا ہی نہیں اس دن تو میں دن بھر سچترا کو اپنے

ساتھ باہر بھی لے جاسکوں گا یہ سوچ کر میں نے رات میں اس ہوٹل میں رک کر صبح ہی سچترا کو حیران کر دینے کا ارادہ کرلیا۔

ہوٹل بھاگلپور شہر کے سب سے اچھے ہوٹلوں مین سے ایک تھا۔ وہاں جا کر میں نے ڈبل بیڈ کا ایک کمرہ بک کروالیا۔ گرمی کے دن تھے۔ رات کے نو بجے تک نہا کے کھانے کے لیے نیچے ریسٹورنٹ میں پہنچا اور کھانا کھا کے جلدی سے تیسری منزل پر اپنے کمرے میں واپس لوٹ آیا۔ ٹرین کے سفر میں تھک جانے کی وجہ سے ہی چادر اوڑھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی درمیان کمرے میں ایک ویٹر داخل ہوا۔

''صاحب، اور کسی چیز کی ضرورت؟''

''نہیں شکریہ، سب کچھ پہلے ہی سے موجود ہے!''

''نہیں، میرے کہنے کا مطلب کسی خاص چیز۔۔۔؟''

''خاص چیز۔۔۔؟''

''ہاں صاحب!''

''کیا مطلب؟'' میں نے چڑھ کر کہا۔

'' صاحب ، سولہ سال سے لے کر چھتیس سالوں تک کی بھی مل جاتی ہے۔ آپ حکم تو کیجیے۔''

''کیا بکواس کر رہا ہے، بھاگو یہاں سے!'' یہ کہہ کر میں نے دروازہ بند کرلیا

۔ تکیے پر سر رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند تھی جو آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی ۔ تھوڑی دیر بعد ٹیوب لائٹ بند کر کے ہلکی چادر اوڑھ کر سونے کی پھر سے کوشش کرنے لگا۔ سچترا کے متعلق سوچنے لگا۔

کٹیہار ضلع میں ایک گاؤں جگدیش پور ہے، جہاں کے زمین دار وکرم سنگھ کی اکلوتی بیٹی سچترا بھاگلپور کے کالج میں بی۔ اے۔ فائنل کلاس میں پڑھتی ہے۔ ابھی پچھلے مہینے ہی تو اس سے میری شادی ہوئی ہے۔

چھ مہینے پہلے پٹنہ میں جب ولوچن کی شادی میں میری سچترا سے ملاقات ہوئی تھی اس کے حسن نے میرے دل کو بے قابو کر دیا تھا۔ نہ جانے اس کی آنکھوں میں کیا تھا کہ اس کے بعد ایک مہینے تک مجھے نیند ہی نہیں آئی ۔ ولوچن میرے ساتھ پٹنہ کے نیا ٹولہ والے ایس بی آئی کے برانچ میں کام کرتا تھا۔ اس کی شادی میں سچترا کا ملنا میرے لیے تو ٹھیک ویسا ہی تھا جیسے راجہ دشینت کو شکنتلا مل جائے۔ پتہ نہیں بھگوان نے اسے کس کے لیے بنایا ہے!، دشینت کی طرح میرے ذہن میں بھی بار بار یہی سوال آ رہا تھا۔

''سچترا ادھر آؤ'' شادی کے منڈپ کے پاس سچترا کو ولوچن نے بلوایا۔ میں تو بارات کی طرف سے ہی تھا۔ ولوچن کی کرسی کے پاس ہی بیٹھا تھا۔

''کیا بات ہے جیجا جی؟''

''رسک! یہ ہے میری پیاری سالی سچترا۔ بھاگلپور کے مشہور ویمنس کالج

میں پڑھتی ہے۔''

''نمسکار!''میں نے ہاتھ جوڑکراس کی طرف دیکھا۔

''نمسکار!''سچترا نے بھی میری طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

''سچترا، یہ میرے کلیگ رسیک سنگھ ہیں۔اسی سال میری برانچ میں ٹرانسفر ہوکرآئے ہیں،کانپور کے رہنے والے ہیں۔''

''جیجا.جی! آپ جلدی چلیے ،آپ کو پنڈت.جی بلارہے ہیں''

اسی وقت ایک دوسری سالی ولوچن کو بلانے آگئی اوراسے لےکراندر پنڈت.جی کے پاس لے گئی۔

''آپ بیٹھیے نا،کرسی آپ کا ہی انتظار کررہی ہے۔''میں نے سچترا کو بیٹھنے کی دعوت دی۔

''شکریہ!''یہ کہہ کر وہ میری بغل والی کرسی پر بیٹھ گئی۔میرے لیےتو ولوچن نے یہ خوبصورت موقعہ فراہم کردیا تھا۔اسی بہانے سچترا کے قریب جانے کا موقع تو ملے گا۔لیکن لفظ تھے کہ زبان پرآ ہی نہیں رہے تھے۔آخرکار سچترا نے ہی شروعات کی۔

''رسک.جی،آپ کو نہیں لگتا کہ یہاں بہت شور ہے؟''

''ہاں،ہےتو۔۔لیکن۔۔۔''

''لیکن کیا؟چلیے میرے ساتھ''یہ کہہ کر سچترا مجھے اپنے ساتھ لے کر چل

حیران

پڑی۔ میں بھی مشین کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ مجھے سیڑھی سے سب سے اوپر کی چھت پر لے گئی۔ وہاں پر پوری چھت کے اوپر مٹی ڈال کر ایک باغ بنا ہوا تھا۔ اس باغ میں خوبصورت سی گھاس اگی ہوئی تھی۔ اسی گھاس پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔

''ہاں، یہاں بہت اچھا ہے'' میں نے دھیرے سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''کیا آپ پہلی بار پٹنہ تشریف لائے ہیں؟''

'' جی!''

''یہاں کیسا لگ رہا ہے؟''

''بہت خوبصورت شہر ہے''

''سچ؟''

''جہاں آپ جیسی خوبصورت دوشیزہ ہوں، اس شہر کے خوبصورت ہونے میں بھلا کیا شبہ ہوسکتا ہے''۔

'' آپ تو مذاق کر رہے ہیں'' سچترا نے شرماتے ہوئے کہا۔ میں جانتا تھا کہ دوشیزائیں تعریف سن کر خوش ہوئے بغیر بھلا کیسے رہ سکتی ہیں۔ لہذا تعریف کے بعد میں اس کے چہرے کا ردعمل دیکھنے کی غرض سے اس کی طرف مخاطب ہوا ۔سچترا نے سر جھکا رکھا تھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں، آپ کے ساتھ ساتھ آپ کا شہر بھی خوبصورت

ہے۔''

''شکریہ'' سچترا نے سر جھکائے ہی جواب پیش کیا۔ ''ویسے کل آپ کا کیا پروگرام ہے؟'' سچترا نے مزید پوچھا۔

''ویسے پانچ بجے تک تو دفتر میں ہی رہتا ہوں۔ اس کے بعد میں بے کار ہی ہوں''۔

''میں کل تک ہی یہاں ہوں۔ پرسوں پھر بھاگلپور روانہ ہو جاؤں گی۔ اگر کل آپ میرے ساتھ دریا گنگا دیکھنے چلنا چاہیں تو میں پانچ بجے پٹنہ کالج کے پاس آپ کا انتظار کروں گی''۔ اور یہ کہہ کر سچترا مجھے پھر شادی کے منڈپ میں لے گئی۔ کھانے کا بھی وقت ہو گیا تھا۔ سچترا اپنے ہی ہاتھوں سے میرے لیے ایک تھالی بھر کر لے آئی۔

''جاتی ہوں، کل ملوں گی، وہیں ---'' صرف اتنا میرے کان میں پھسپھساتے ہوئے وہ چل پڑی۔

''آپ نہیں کھائیں گی کیا؟''

''نہیں شکریہ! ---کل---وہیں ---'' اور وہ جملے کو مکمل کیے بغیر ہی اندر لڑکیوں کے ہجوم میں کھو گئی۔ اور اس طرح کھانا ختم کر کے میں ولوچن کے پاس گیا اور اس سے اجازت لے کر اپنے کمرے کی طرف نکل گیا۔ کمرے میں کپڑے تبدیل کر کے بستر پر لیٹ گیا اور شام کے واقعہ پر نظر ثانی کرنے لگا۔

حیران

آج سے پہلے اتنی خوبصورت لڑکی کبھی دیکھی نہیں ۔آج چند لمحات اس کے ساتھ گزارنا ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے سورگ میں کسی اپسرا کے ساتھ کچھ وقت گزارآیا ہوں ۔ میں نے دل ہی دل میں ولوچن کا شکریہ ادا کیا۔ یہی سوچتے نہ جانے کب رات کے تین بج گئے ۔ بالکل پتہ ہی نہیں چلا۔

دوسرے دن صبح سات بجے اٹھ کر جلدی تیار ہوا۔خود کو اچھی طرح سجایا، سنوارا جیسے میدان جنگ پر جانا ہو۔ دس بجے اسکوٹر لے کر اپنی برانچ کی طرف نکل گیا۔اس دن ولوچن چھٹی پر تھا۔کس سے باتیں کرتا۔میرا تو ویسے بھی صرف جسم ہی برانچ میں تھا دل تو پچھلی رات سے ہی سچترا کی زلفوں میں گرفتار تھا۔خیر کسی طرح شام کے پانچ بج گئے ۔اور پھر اسکوٹر نکال کر پٹنہ یونیورسٹی کی جانب روانہ ہو گیا۔ پٹنہ یونیورسٹی اور اس کے تمام کالج دریا گنگا پر ہی مقیم ہیں ۔ سچترا نے اس دن مجھے پٹنہ کالج کے پیچھے پڑنے والے کنارے پر بلایا تھا۔دس منٹ میں میں دریا گنگا پر تھا لیکن کہیں بھی سچترا دکھائی نہیں پڑی ۔میں وہیں دریا کے کنارے بنی سیڑھیوں پر بیٹھ کر دریا میں آتی ہوئی لہروں کو دیکھنے لگا اور وہیں بیٹھ کر سچترا کا انتظار بھی کرنے لگا۔ دریا کے اس کنارے پر شام میں اکثر کالج کے ہاسٹلوں سے نکل کر لڑکے اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ وہاں بیٹھا کرتے تھے۔ پٹنہ کالج سے لگا ہوا ہی تھا لڑکیوں کا مشہور ہاسٹل جی۔ڈی۔ایس۔گرلز ہاسٹل۔ میں نے سنا تھا کہ اسی ہاسٹل میں یونیورسٹی کے تمام کالجوں کی لڑکیاں رہتی ہیں۔

''ہائے جنٹل مین!'' میں اپنے خیالوں میں گم تھا کہ پیچھے سے سچترا کی آواز آئی۔

''ہائے!'' میں نے بھی دھیرے سے اس کے ہائے کا جواب دیا۔

''کیا بات ہے، کافی دیر سے آئے ہوئے ہیں؟''

''زیادہ تو نہیں، صرف پندرہ منٹ ہی ہوئے ہیں۔''

''اور۔۔۔رات کیسی گزری۔۔۔سب خیریت تو ہے؟'' سچترا نے قتل کرنے والے انداز میں پوچھا۔

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''کیا بات ہے، سب خیریت تو ہے؟'' سچترا نے میرے رخسار کو ہلاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ہے!'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''پھر یہ منہ لٹکا ہوا کیوں ہے! چلئے، اٹھیئے، میں آپ کو دریا کے دوسرے کنارے کی جانب لے چلتی ہوں۔'' یہ کہہ کر سچترا نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھایا ۔میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ مجھے تھوڑی دور آگے دوسرے کنارے پر لے گئی۔ وہاں بھی کافی لڑکے لڑکیاں بیٹھے تھے۔ اس کنارے کا نام کرشنا گھاٹ تھا۔ وہاں بھی کنارے پر سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ سچترا نے مجھے دریا کے بالکل قریب کی سیڑھی پر لے جا کر بٹھا دیا اور خود بھی میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''یہاں کیسا لگ رہا ہے؟''

''یہ جگہ تو اور بھی اچھی ہے، لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی ۔''

''وہ کیا؟''

''تم بھاگلپور میں پڑھتی ہو اور تمھارا گھر بھی یہاں نہیں ہے۔۔''

''پھر؟''

''پھر تم ان جگہوں کے بارے میں اتنی اچھی طرح کیسے جانتی ہو؟''

''اوہ! آپ کو اب پوری بات بتانی ہی پڑے گی ۔ دراصل یہاں میرے چاچا جی رہتے ہیں، جن کی بیٹی کے ساتھ آپ کے دوست دلوچن جی کی شادی کل رات ہوئی ہے ۔ میری اسکولی تعلیم بھی اسی شہر میں ہوئی ہے۔ کالج کی تعلیم کے لیے پتا جی نے بھاگلپور بلا لیا ۔ دراصل بھاگلپور میرے گھر کے نزدیک ہے۔''

''تمھارے گھر میں کون کون ہیں؟'' میں نے ایک چھوٹا سا سوال کیا۔

''صرف ماں اور پتا جی ، اور کوئی نہیں ۔'' سچترا کی آواز میں تھوڑی مایوسی تھی ۔ پھر میں کچھ اور نہیں پوچھ سکا۔ تھوڑی دیر وہیں کرشنا گھاٹ پر ہی ہم دونوں بیٹھے رہے ۔ گنگا کی دھارا کو دیکھتے رہے۔ چاروں طرف اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو سب جا چکے تھے۔ صرف ہم دونوں ہی گھاٹ پر رہ گئے تھے۔

''اب ہمیں چلنا چاہیے!'' سچترا کی آواز تھی۔

''خیر، کل تو تم بھاگلپور جارہی ہو، پھر کب آ ؤ گی؟''

''پتہ نہیں، گھر میں شادی کی بات بھی چل رہی ہے، اب تو شادی کے بعد ہی کبھی آسکوں گی۔''

''کیا۔۔۔! پھر میں یہاں کیسے رہوں گا؟'' جملے کا آخری حصہ میں نے دل ہی میں دبالیا۔

''اب ساڑھے سات بج چکے ہیں، گھر میں چاچی انتظار کر رہی ہوگی۔''

''خیر چلو اسکوٹر پر بیٹھو۔''

پھر میں اسے اسکوٹر پر بٹھا کر اشوک راج پتھ کے شبھ راج ریسٹورنٹ لے گیا ، جہاں ہم دونوں نے مکسڈ چاٹ کھائی۔ اس کے بعد میں اسے اس کے چاچا جی کے گھر راجندر نگر چھوڑ آیا۔

دوسرے دن اپنی برانچ میں، میں ولوچن سے ملا اور خیر وخبر کے بعد اپنی بات کہہ دی۔

''یار! ولوچن تم نے اپنا کلیان تو کرلیا۔ اب میرا کلیان کیسے ہوگا؟''

''ارے کیسا کلیان، کس کا کلیان؟ ذرا صاف صاف تو بتاؤ۔''

''بھئی اب جان بوجھ کر اناڑی نہ بنو۔ اپنی شادی کر لی اور میں کیا زندگی بھر کنوارا ہی بیٹھا رہوں گا؟''

''اچھا، تو یہ بات ہے! خیر بتاؤ کوئی لڑکی نظر میں ہے؟''

''ہے کیوں نہیں! نظر میں بھی ہے اور گھر میں بھی''۔

''کون ہے وہ خوش قسمت؟''

''تمھاری سالی سچترا!''

''اچھا، واہ بیٹے! میرے ہی گھر میں ڈاکہ۔۔۔! خیر چلو کوئی بات نہیں۔ آج ہی سسر جی سے بات کروں گا۔ کل وہ جگدیش پور جا رہے ہیں۔ وہاں تمھارے بارے میں بات چلائیں گے۔'' ولوچن نے مجھے بھروسہ دلایا۔

دوسرے دن سچترا بھاگلپور چلی گئی۔ ولوچن کے سسر بھی جگدیش پور چلے گئے۔ اس کے ایک مہینہ بعد سچترا کے پتا جی ایک بار مجھے دیکھنے آئے۔ مجھ سے مل کر وہ کافی خوش ہوئے اور پھر وہ مجھ سے پتہ لے کر کانپور چلے گئے میرے پتا جی سے ملنے۔ وہاں سے پھر کچھ دنوں بعد پتا جی بھی ایک دو لوگوں کو ساتھ لے کر سچترا کو دیکھنے گئے۔ اس کے بعد دھوم دھام سے ہماری شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد سچترا پھر پڑھائی کرنے کے لیے جگدیش پور سے بھاگلپور چلی گئی۔ ابھی شادی کا ایک مہینہ ہی تو گزرا ہے۔ آج سنیچر تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آج شام بھاگلپور آ کر اسے حیران کر دوں گا۔

اسی خیال میں تھا کہ دروازے پر کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔

''دروازہ کھلا ہے، آجاؤ''

''صاحب، وہ چیز آگئی ہے۔'' یہ اسی ویٹر کی آواز تھی جو تھوڑی دیر پہلے ایک

خاص چیز کی پیش کش کر گیا تھا۔

''تم پھر آ گئے ، میں تمھیں منع کیا تھا۔ مجھے نہیں چاہیے کچھ بھی ، چلو بھا گو!''

''صاحب جاتا ہوں ، لیکن اپنی چیز تو سنبھالیے۔'' یہ کہہ کر وہ اندھیرے میں کہیں کھو گیا۔ میں نے برآمدے میں جل رہی ٹیوب لائٹ کی روشنی میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ ایک دوشیزہ میرے پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی ہے۔ میں نے دھیرے سے اپنے کمرے کی ٹیوب جلائی۔

''ارے بچترا تم ۔۔۔اور یہاں ۔۔۔؟'' میری تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور ہو بھی کیسے سکتا تھا۔

حیران

زردِ دل

شہر کے پوسٹ گریجویٹ کالج میں آئے ابھی مجھے صرف ایک مہینہ ہی ہوا تھا ۔دہلی یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس چھوٹے سے کالج میں پڑھانا کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ تمام اساتذہ اور دیگر کارکنوں سے ابھی ٹھیک سے تعارف بھی نہیں ہو پایا تھا۔کوئی بھی ٹھیک سے گفتگو نہیں کر رہا تھا۔ایک یا دو کو چھوڑ کر باقی سبھی خود میں ہی سمٹے دکھائی پڑ رہے تھے۔

بدچلن

ایک دن صبح ۱۰ بجے میری ایک مخصوص کلاس تھی۔ کلاس کے بعد اسٹاف روم میں میں نے ایک خوبصورت خاتون کو دیکھا۔ ہری ساڑی میں ملبوس اور پھر اس پر چشمہ اس کے حسن میں چار چاند لگا رہے تھے۔ گپتا جی نے پھر اس سے میرا تعارف کروایا،

''شریش جی! یہ ملکا جی ہیں، انگریزی ادب پڑھاتی ہیں!''

''ہلو!'' ملکا نے سرد مہری سے جواب دیا۔ پھر میں نے بھی ہاتھ جوڑ کر اسے نمسکار کیا۔

''اور آپ شریش جی ہیں۔ ابھی ابھی شعبہ سنسکرت میں جوائن کیا ہے!''

پروفیسر گپتا نے مسکراتے ہوئے تعارف کی رسم ادا کی۔ لیکن یہ کیا؟ ملکا کے چہرے پر تھوڑی بھی مسکان نہیں۔ مجھے تھوڑا تعجب بھی ہوا۔ انگریزی ادب پڑھانے والی استانی اتنی خشک کیسے ہو سکتی ہے۔ 'ایکسکیوزمی' کہہ کر وہ اپنی کلاس کو پڑھانے چلی گئی۔ پھر میں بھی تھوڑی دیر میں اپنی کلاس میں چلا گیا تھا۔

دوسرے دن کالج پہنچتے ہی پرنسپل نے بلوالیا۔ ''شریش جی! کل این۔ ایس۔ ایس کی لڑکیوں کی یونٹ کا ایک دس دنوں کا کیمپ شروع ہونے جا رہا ہے۔ اس یونٹ کی پروگرام آفیسر ملکا جی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تعاون کے لئے آپ بھی ان کے ساتھ چلے جائیں۔''

''جی، بہت اچھا! میں کل چل پڑوں گا۔ کتنے بجے چلنا ہوگا؟''

''کل صبح نو بجے کالج کے گیٹ سے بس سینجی گاؤں کے لئے روانہ ہوگی۔ آپ کے تعاون کے لئے کالج کے دو چپراسی بھی ساتھ جائیں گے۔''پرنسپل نے تفصیل سے کیمپ کا پروگرام سمجھایا۔

مجھے تو بالکل ہی عجیب سا لگ رہا تھا۔ایک تو لڑکیوں کا کیمپ دوسرا پہلی بار کسی ٹیم کے ساتھ جانا ہو رہا تھا اور وہ بھی لڑکیوں کی ٹیم۔اور ساتھ میں ملکا جیسی خشک خاتون۔تمام باتیں میرے خلاف جا رہی تھیں ۔ پتہ نہیں کس مٹی کی بنی ہوئی ہے! نہ کبھی ہنستی ہے نہ کبھی کسی بات چیت میں شامل ہوتی ہے ، ہمیشہ چہرے پر ایک سنجیدگی کا نقاب اوڑھے رہتی ہے۔نہ جانے کیسے بچوں کو انگریزی ادب پڑھاتی ہوگی۔بچوں کا خدا ہی اب مالک ہے۔

خیر، دوسرے دن ٹھیک ۹ر بجے میں لڑکیوں کی ٹیم کے ساتھ نکل پڑا۔بس میں سبھی لڑکیوں کو بٹھا کر سب سے آگے کی سیٹ پر میں بیٹھ گیا تھا۔تھوڑی دیر بعد ملکا بھی بس کے اندر داخل ہوئی۔ سبھی لڑکیوں پر ایک نظر ڈال کر پھر میری بغل والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔میں تو پہلے سے ہی ڈرا ہوا تھا۔میں زندگی میں کبھی بھی سنجیدہ نہیں رہا۔میں کسی نہ کسی بہانے سے اپنی سیٹ بدلنے کی سوچنے لگا۔

''ادھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہیں، ٹھیک سے بیٹھئے۔بس چل پڑی ہے!''

''ساری میڈم! میں ۔۔۔ میں ذرا۔۔۔''

''میں ۔۔۔ میں کچھ نہیں، سامنے دیکھئے!''میری ہکلاہٹ پر ملکا نے تقریباً

ڈانٹتے ہوئے کہا۔ اس کے اس جملے کو سن کر بھلا کس میں اتنی ہمت ہو سکتی تھی کہ ادھر ادھر دیکھنے کی جرأت کرے۔ بار بار اپنے پرنسپل پر غصہ آ رہا تھا۔ نہ جانے کس جنم کا بدلا لیا ہے انہوں نے مجھ سے۔ اس خشک خاتون کے ساتھ جانے کے لئے کیا پورے کالج میں میں ہی بچا تھا!

تقریباً ۱۲ر بجے ہم لوگ سینجی گاؤں پہنچے۔ وہاں ہم لوگ بس سے اتر کر اپنے سامانوں کے ساتھ گاؤں کے پرائمری اسکول کی طرف چل پڑے۔ ہماری مدد کے لئے اسکول کے کچھ لڑکے بھی آ گئے تھے۔ وہاں اسکول میں صرف تین ہی کمرے تھے۔ ان میں ایک کمرے میں تو کھانا پکانے کے لئے دونوں چپراسیوں نے ہی قبضہ جما لیا تھا۔ دوسرے اور تیسرے کمروں میں لڑکیوں نے اپنے بستر رکھ دئے اور اسی میں ملکا نے بھی ایک کونے میں اپنا بستر ڈال لیا۔ میں رات میں کہاں سوؤنگا یہ ایک مسئلہ تھا۔

دو بجے تک دونوں چپراسیوں نے کھانا تیار کر دیا تھا۔ پھر ہم سبھوں نے کھانا کھایا۔ اس کے بعد اسکول کے سامنے ہی پھیلے ہوئے کھیتوں میں ہری ہری گھاسوں پر بیٹھ کر ہم نے دھوپ سینکی۔ سبھی کے ساتھ گپ شپ ہو ہلہ کیا۔ اور اسی طرح شام کے پانچ بج گئے تھے۔ ہمارے چپراسی شو پرساد نے چائے تیار ہونے کی اطلاع دی اور ملکا کا پیغام دیا، ''میڈم چائے پینے کے لئے بلا رہی ہیں!''

''چلوابھی آتا ہوں!'' یہ کہہ کر پھر میں باقی لڑکیوں کو بھی لے کر اسکول کے اندر چل پڑا۔ وہاں چائے پیتے پیتے ہی مستقبل کے پروگراموں کو بھی طے کیا گیا۔ اس کے بعد ملکا نے مجھے این۔ ایس۔ ایس۔ کے متعلق ایک چھوٹی سی تقریر لڑکیوں کے سامنے کرنے کو کہا۔

اس تقریر کے بعد وہاں ایک حضرت تشریف لائے ،''میں شورویر سنگھ چوہان ،اس گاؤں کا پردھان آپ تمام لوگوں کا اپنے گاؤں میں استقبال کرتا ہوں۔''

''جی میں اپنے کالج کے پرنسپل اپنی یونٹ کی پروگرام آفیسر اور خود اپنی جانب سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ سنا ہے اس گاؤں کے پردھان دہلی یونیورسٹی سے پڑھکر آئے ہیں؟''

''شاید میرے متعلق ہی کہہ رہے ہوں گے!''

''آپ سے مل کر واقعی بڑی مسرت ہوئی ہے، میں بھی آپ کی یونیورسٹی سے ہی پڑھکر آیا ہوں اور آج کل آپ کے کالج میں سنسکرت پڑھا رہا ہوں۔ میرا نام شریش سنگھ ہے۔'' میں نے اپنا مختصر تعارف پیش کیا۔

''اچھا تو ہم دونوں ایک ہی یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے ہیں۔ تب تو اور بھی جمے گی۔'' ڈاکٹر صاحب اب تو آج سے آپ میرے ہی مہمان ہیں۔ میں چاہتا ہوں آپ میرے یہاں ہی رکیں۔''

میں نے پھر ملکا کی طرف دیکھ کر اس کا تعارف بھی کرایا۔'' آپ ڈاکٹر ملکا

پانڈے، میری یونٹ کی پروگرام آفیسر ہیں۔ میں آپ کے تعاون کے لئے ہی آپ کے ہمراہ حاضر ہوا ہوں۔''

''اچھا تو میڈم، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ڈاکٹر صاحب آج سے میرے مہمان رہیں گے۔ دن بھر یہ آپ کے ساتھ رہیں گے اور رات میں میرے ساتھ۔''

ملکا کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی ہنسی چند لمحوں کے لئے نمودار ہوئی۔ اور پھر چوہان صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے۔ ان کا گھر اسکول سے بالکل لگا ہوا تھا۔ خیر میں وہاں سے نکلا جیسے کوئی قید خانے سے نکلا ہوں وہاں چوہان صاحب کے ساتھ چائے کا ایک دور چلا۔ ان کی بھتیجی یوتھکا جو میرے ہی کالج میں بی۔اے۔ فرسٹ پارٹ میں پڑھتی تھی نے چائے کے بعد بتایا کہ چاچا جی ۳۳ رسال کے ہو گئے ہیں اور ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ اپنے کمرے میں تنہا ہی قیام کرتے ہیں اور سماجی کاموں میں خود کو مصروف رکھتے ہیں۔ پچھلے سال انہیں گاؤں کے لوگوں نے انہیں پردھان منتخب کیا ہے۔

رات کے آٹھ بجے شو پرساد پھر حاضر ہوا ملکا کا حکم نامہ لے کر۔

''سر! میڈم نے بلوایا ہے!''

''چلو، آتا ہوں!''

''سر کھانا بھی بن گیا ہے، گرم گرم کھا لیں تو ٹھیک رہے گا۔''

''ٹھیک ہے!'' میں نے شِو پرساد کو روانہ کر کے جلد ہی چوہان صاحب سے اجازت لی اور اسکول کی جانب چل دیا۔ وہاں جا کر اگلے دن کے پروگراموں کے متعلق تھوڑا مشورہ ہوا۔ اس کے بعد شِو پرساد نے کھانا لگا دیا۔ دونوں چپراسیوں شِو پرساد اور کشوری لال نے واقعی بہت اچھا کھانا بنایا تھا۔ اس کے بعد ملکا سے اجازت لے کر میں چوہان صاحب کے یہاں چل پڑا تھا۔ راستے میں یوتھکا نے راستہ روکتے ہوئے کہا،''سر! اسکول میں ایک ہی باتھ روم ہے لہذا کافی پریشانی ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں سویتا، للتا، اور سمترا کو لے کر اپنے گھر جاؤں؟ صبح پھر حاضر ہو جائیں گے ہم لوگ؟''

''میڈم تو کبھی بھی اجازت نہیں دیں گی!'' للتا نے کہا۔

''میڈم کیا کہتی ہیں؟''

''سر پلیز!'' سمترا کی آواز تھی

''چلو، چپ چاپ نکل جاؤ! صبح ۷ر بجے سے پہلے ہی اسکول میں داخل ہو جانا'' میں نے اپنی جان چھڑائی۔ پھر چاروں لڑکیاں میرے پیچھے پیچھے ہی چل پڑیں۔ چوہان صاحب والی بلڈنگ کے پیچھے والی بلڈنگ میں ان کے بھائی، بھابھی، والدین اور بچے رہتے تھے۔ وہیں ان کی بھتیجی یوتھکا بھی رہتی تھی۔ وہ اپنی سہیلیوں کو لے کر وہیں چلی گئی۔ میں چوہان صاحب کے یہاں جا کر جم گیا۔ مجھے وہاں چھوڑ کر یوتھکا چلی گئی تھی۔ چوہان صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔

میں ان کا انتظار کرنے لگا۔ بیٹھے بیٹھے ٹی۔وی۔دیکھتا رہا۔

رات کے بارہ بجے چوہان صاحب حاضر ہوئے۔''کیا بات ہے، آج کافی دیر ہوگئی لوٹنے میں چوہان صاحب کو؟

''جی بس پاس کے گاؤں میں کئی دنوں سے ایک جھگڑا چل رہا تھا اسے ہی نپٹانے میں تھوڑی دیر ہوگئی۔ یہاں آپ کو کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟''

''جی نہیں یہاں تو آپ کے بچوں نے کوئی کمی رہنے ہی نہ دی۔ بس مجھے آپ کی فکر ہو رہی تھی۔!''

''ڈاکٹر صاحب! میرا تو یہ روز کا کام ہے۔ روز کوئی نہ کوئی جھگڑا لے کر لوگ آجاتے ہیں۔ جانا ہی پڑتا ہے۔ کیا کریں!'' چوہان صاحب نے کپڑے بدلتے ہوئے کہا۔ پھر رات کے دو بجے تک ہم لوگ بات چیت کرتے رہے۔ ہم دونوں دہلی یونیورسٹی کی اپنی پرانی یادوں کو تازہ کرتے رہے۔ پھر پتہ نہیں کب نیند آگئی۔

صبح اٹھنے میں تھوڑی دیر ہوگئی۔ جلدی سے تیار ہو کر میں اسکول کی طرف بڑھا۔ ناشتہ تقریباً ختم ہونے پر تھا۔ چائے تو ختم ہو ہی گئی تھی۔ جلدی سے ایک بریڈ پکوڑا کھا کر پانی پیا۔ اس کے بعد ملکا کا بھی پیغام آگیا تھا۔

''کیا بات ہے، دیر کیوں ہوگئی؟'' ملکا نے گھورتے ہوئے پوچھا تھا۔

''دراصل چوہان صاحب رات تھوڑی دیر سے گھر پہنچے تھے۔ ان سے بات

چیت میں ہی تھوڑی دیر ہوگئی سونے میں۔''میں نے صفائی دی۔

''آپ کو پتہ ہے آپ نے کیا کیا ہے؟''

''جی نہیں، کیا ہوا؟''میں نے سہمے سہمے ہی پوچھا۔

''آپ کے نقش قدم پر ہی چار لڑکیاں اسکول سے اپنے گھر چلی گئی تھیں اور آج دیر سے واپس آئی ہیں!''

''اچھا؟''میں نے انجان بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''انہیں آپ نے اجازت دی تھی؟''

''جی۔۔۔!''میری جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔

''آخر کیوں؟ آپ کو پتہ ہے این۔ایس۔ایس۔کی کچھ روائتیں ہیں! میں پروگرام آفیسر ہوں۔ایک بار مجھے تو بتایا ہوتا!''

''میڈم! اگر آپ ہی پروگرام آفیسر ہیں، سب کچھ آپ ہی کو کرنا تھا تو پھر مجھے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں کل واپس جا رہا ہوں، سب کچھ آپ ہی سنبھالیے!''مجھے بھی غصہ آ گیا تھا۔اور پھر غصے میں میں پھر چوہان صاحب کی طرف چل دیا۔وہاں جا کر اپنے کپڑے وغیرہ پیک کرنے لگا۔چوہان صاحب کہیں باہر تھے۔وہاں اپنا سامان پیک کر کے تھوڑی دیر لیٹ گیا۔سوچنے لگا،'' پتہ نہیں یہ عورت آخر چاہتی کیا ہے ہر وقت پولیس انسپکٹر کی طرح ڈانٹ پھٹکار کرتی رہتی ہے۔نہ جانے اپنے گھر میں کس طرح رہتی ہوگی۔لگتا ہے وہاں بھی

سبھوں کو چوبیسوں گھنٹے دہشت میں ہی رکھتی ہوگی۔انہیں خیالوں میں تھا کہ اچانک کشوری لال حاضر ہوا۔ ''میڈم نے یہ چٹھی بھیجی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ فوراً لوٹ گیا۔ چٹ میں لکھا تھا ''شریش جی !میں شام میں آپ سے بات کروں گی اس کے بعد ہی یہاں سے جانے کے متعلق کوئی فیصلہ لیجئے گا۔''

اسی وقت چوہان صاحب آ گئے تھے۔ ''کیا بات ہے،سب خیریت تو ہے؟

''سب ٹھیک ہی ہے۔۔۔''

''پھر بھی۔۔۔؟''

''تھوڑا سر میں درد ہے؟''میں نے بہانا بنایا۔

'' کچھ دوائی منگواؤں؟''

''نہیں میرے پاس ڈسپرین ہے! آپ کہاں چلے گئے تھے؟'' میں نے موضوع بدلنے کی غرض سے پوچھا۔

'' بغل کے گاؤں میں کلیکٹر کا پروگرام تھا۔ وہیں گیا ہوا تھا۔ وہاں بیس سوتری کاریہ کرم کے متعلق ایک میٹنگ تھی۔''

''وہاں کیا کیا ہوا؟''

'' آپ تو جانتے ہی ہیں ، یہ آفیسر اپنے آپ کچھ بھی نہیں کرتے ۔ بڑی مشکل سے اپنے اسکول میں ایک اور کمرے کے لئے ان سے اجازت لی ہے۔ اگلے ماہ کمرہ بننا شروع ہو جائے گا۔''

دن کے بارہ بجے یوتھکا بلانے آ گئی، ''سر! میڈم نے بلایا ہے کھانے کے لیئے!'' اور پھر کھانے کے بعد وہیں اسکول کے سامنے ہی کھیتوں میں سورج کی گرم گرم دھوپ کھانے لگا۔ آس پاس پانچ سات لڑکیاں بھی جمع ہو گئی تھیں۔ وہاں بیٹھ کر کافی دیر تک دھوپ کھاتا رہا، چاروں طرف پھیلے پہاڑوں کو نہارتا رہا۔ سینجی گاؤں کے چاروں طرف خوبصورت پہاڑوں کو نہارنا کتنا مزہ دیتا ہے یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔ لیکن ملکا کی وجہ سے یہ مزہ جاتا رہا۔

تین بجے سبھی لڑکیوں کے ساتھ میں بجھے دل سے دوسرے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ وہاں کے اسکول کے استادوں اور طلباً سے ہم لوگوں نے ان کے مسائل کے متعلق گفتگو کی۔ وہاں بھی ملکا کے حکم کے مطابق مجھے ایک تقریر کرنی پڑی۔ اس تقریر میں میں نے طلباً کو سماجی خدمات کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کچھ باتیں بتلائیں۔ اس کے بعد گاؤں کے تمام اراکین سے مل کر ہم لوگ ۶ ربجے تک اپنے گاؤں سینجی لوٹ آئے۔

وہاں چائے پی کر سبھی اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے کی غرض سے چلے گئے۔ میں بھی یوتھکا کو لے کر چوہان صاحب کی طرف چل پڑا۔ وہاں منہ ہاتھ دھو کر ٹی۔ وی۔ پر کچھ پروگرام دیکھنے بیٹھ گیا۔ اسی درمیان یوتھکا پھر چائے لے آئی۔ یوتھکا کے جذبہ خدمت کو دیکھ کر میں 'نا' نہیں کر سکتا تھا۔ پھر چوہان صاحب سے باتیں کرتے کرتے رات کے ساڑھے آٹھ بج گئے تھے۔ ایک

لڑکی نے آ کر پھر میڈم کا پیغام دیا۔ میں اور یوتھکا دونوں اسکول کی طرف بڑھ گئے تھے۔ سیدھا باورچی خانے کی طرف گیا، ''سبھوں نے کھانا کھالیا کیا؟'' میں نے شِو پرساد سے پوچھا۔

''جی صرف میڈم بچی ہوئی ہیں!'' شِو پرساد نے اطلاع دی۔

''اچھا! لگا دو!'' پھر میں نے اور ملکا نے ساتھ ساتھ ایک ہی لائن میں کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ملکا نے اپنے پرس سے الائچی نکال کر مجھے پیش کی۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک الائچی لی۔ پھر ملکا نے بھی ایک لی اور شِو پرساد سے کہا، شِو پرساد جی! ہم لوگ ابھی آ رہے ہیں ذرا چہل قدمی کر کے، آپ لوگ ذرا بچوں کا دھیان رکھئے گا۔'' پھر ملکا چل پڑی۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی نکل پڑا۔ چلتے چلتے ایک پگڈنڈی پر وہ بیٹھ گئی۔ میں بھی چپ چاپ اس کی بغل میں بیٹھ گیا تھا۔ رات بالکل اندھیری آسمان میں تارے ٹمٹمارہے تھے۔ اور ہم دونوں کے درمیان خاموشی طاری تھی۔ کافی دیر تک خاموشی ہی رہی۔ آخر میں ملکا نے ہی خاموشی کو ختم کیا۔

''کیا بہت غصہ ہے؟''

''۔۔۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''کیا ہوا! شریش! تم تو جانتے ہی ہو میں بہت ہی پاگل قسم کی ہوں! مجھے تو بالکل ہی کوئی عقل نہیں! کبھی پڑھے لکھے لوگوں میں رہی ہی نہیں، سلیقہ کہاں سے

آتا۔'' ملکا نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''۔۔۔'' میں نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔

''شریش! اب تو غصہ تھوک دو! میں جانتی ہوں پورے کالج میں صرف تمہیں ہو جو دوستی کے قابل ہو۔ جب تم پہلی بار کالج میں دکھے تھے تبھی میں جان گئی تھی تمہارے جیسا عالم اس کالج میں کوئی دوسرا نہیں!'' ملکا نے میرے گال کو سہلاتے ہوئے کہا۔

'' آج صبح تم نے سبھی لڑکیوں کی سامنے جو میرے ساتھ کیا، کیا وہ ٹھیک تھا؟''

''آئی ایم ساری بابا!'' تاروں کے مدھم مدھم روشنی میں ملکا کی کنٹیلی مسکان صاف دکھائی دے رہی تھی۔

''رات کے دس بج رہے ہیں، تمہیں ڈر نہیں لگ رہا''

''ڈر کس بات کا! جب میرے ساتھ شریش جیسا بہادر آدمی ہو تو میں رات میں گا بھی سکتی ہوں! گا کر سناؤں کیا؟''

''گانا۔۔۔! اور تم؟'' میں نے حیرانی ظاہر کی۔

''تمہارے ساتھ رہ کر گانے کو بھی جی چاہتا ہے!''

''اچھا۔۔۔تو سناؤ!'' میرا غصہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔ اب رات کا اندھیرا خوشگوار لگ رہا تھا۔ آج میں نے ملکا کا ایک الگ ہی روپ دیکھا تھا۔ مجھے یقین

نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی ملکا ہے جو آج صبح تک تھی۔

'جایئے، آپ کہاں جائیں گے

یہ نظر لوٹ کے پھر آئے گی

دور تک آپ کے پیچھے پیچھے

میری آواز چلی جائے گی۔۔

-----------، ملکا کی یہ آواز میرے کانوں میں دیر تک مسری گھولتی رہی اور میں نے اپنے ہوش و حواس کھو کر اپنا سارا وجود اس کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ نہ جانے کب رات کے بارہ بج گئے تھے۔ میں نے اچانک ملکا کو جگایا، ''چلنا نہیں کیا؟''

''ابھی تھوڑی دیر اور میرے پاس بیٹھو شریش! نہ جانے پھر کب اس طرح ملنا ہو۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں!''

''ایسا مت کہو!'' میں نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور اسے اپنے ہاتھوں سے اٹھایا۔ ہم دونوں میں سے کسی کی بھی طبیعت وہاں سے جانے کی نہیں ہو رہی تھی۔

''اب کل جاؤ گے، شریش؟'' ملکا نے پوچھا تھا۔ ''اپنی ملکا کو چھوڑ کر کیسے جا سکوں گا!'' یہ سنتے ہی ملکا باہنوں سے لپٹ گئی۔

چوہان صاحب کے پاس پہنچتے پہنچتے رات کے ایک بج گئے تھے۔ وہ ابھی تک اخبار پڑھ رہے تھے۔ شاید میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔

''ڈاکٹر صاحب! سنا ہے آج آپ جا رہے تھے؟''

''آپ کے پیار کو چھوڑ کر جانے کی حماقت میں کر سکتا ہوں؟

''شکریہ! آپ کے درد سر کا کیا حال ہے؟

''جناب درد سر تو گیا اب درد دل کا پوچھئے!''

میں نے جملے کا آخری حصہ اپنے دل میں ہی چھپا لیا تھا۔

غموں کا بوجھ

''نشیتھ جی، کمل کے متعلق کچھ معلوم ہوا؟'' دہلی یونیورسٹی کی سینٹرل ریفرینس لائبریری میں مقیم ریسرچ فلور کے کینٹین میں سلوچنا نے کافی کا آرڈر دیتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں تو، کیا ہوا؟'' مجھے تھوڑی حیرت ہو رہی تھی۔

''اس کی شادی ہوگئی۔''

''سچ!''

''جی!''

''چلو اچھا ہوا اب ونتا کی زندگی بھی پٹری پر چل پڑے گی۔ بہت دنوں سے بچاری پریشان تھی۔ ہے بھگوان! تمہارے گھر میں دیر ضرور ہے لیکن اندھیر نہیں!'' میں نے اطمینان کی سانس لی۔

''لیکن اس میں زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے؟''

''کیوں؟''

''اس کی شادی ونتا سے نہیں ہوئی ہے!''

''کیا کہہ رہی ہیں آپ!'' مجھے تو یقین ہی نہیں ہو رہا ہے۔

''رات میں کمل نے ہی ٹیلی فون پر اطلاع دی ہے۔ اس نے بتایا کہ ماں کی ضد کے آگے وہ کچھ بول نہیں سکا۔ راستے میں ان کی ایک سہیلی آ گئی۔ انہیں کی بیٹی سے شادی کرنی پڑی۔ سنا ہے کافی جہیز ملا ہے۔'' سلوچنا نے پوری تفصیل بتائی۔

''ہائے کمل ناتھ! یہ تم نے کیا کیا؟'' اس سے آگے میں کچھ نہ بول سکا۔

''خیر کافی کے علاوہ اور کیا لیں گے نشیتھ جی!''

''بس کافی کافی رہے گی۔'' میری طبیعت تو اب کافی پینے کی بھی نہیں ہو رہی تھی۔ سلوچنا کافی لینے اندر کینٹین میں گئی۔ میں کرسی پر بیٹھا ونتا کے متعلق سوچتا رہا۔۔۔

بدچلن

دہلی یونیورسٹی کے اپنے دوستوں کی منڈلی میں ونتا سب سے حسین لڑکی تھی۔ پچھلے ایک سال سے اس کا کمل ناتھ کے ساتھ عشق چل رہا تھا۔ یہ بات منڈلی کے تمام لوگوں کو پتہ تھی۔ ویسے کمل ناتھ تواری میرا سب سے قریب کا دوست تھا لیکن محبت کے متعلق اس کا فلسفہ سن کر مجھے ہمیشہ اس کے مستقبل کے بارے میں فکر رہتی تھی۔

پچھلے سال جب میں اس کے گھر مکھر جی نگر گیا تھا تو وہاں ایک لڑکی کو دیکھا تھا ۔کمل ناتھ نے مجھے اس سے ملوایا، ''یہ سنیتا ہے!'' اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں پھر واپس آ گیا تھا۔ بعد میں پھر ایک بار وہ مجھے پٹیل چیسٹ بس اسٹینڈ پر ملی تھی، ''نمسکار نشیتھ جی!''

''سنیتا جی نمسکار!'' میں نے بھی اس کی نمسکار کا جواب دیا تھا۔

''کہاں جا رہے ہیں؟''

''میں تو گھر ہی جا رہا ہوں، لیکن آپ یہاں؟''

''کمل کا انتظار کر رہی ہوں، پانچ بج چکے ہیں لیکن ابھی تک اس کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ نہ جانے کہاں چلا گیا؟'' اس کی آواز میں فکر تھی۔

''یہ لیجئے، کمل جی آ گئے !'' پیچھے سے کمل حاضر ہوا تھا۔

''نشیتھ جی آپ ذرا دیکھئے یہ ابھی ہی اتنا انتظار کروا رہا ہے، مستقبل میں نہ جانے کتنا کروائے گا!''

''آپ فکر نہ کریں کمل بہت ہی شریف آدمی ہیں۔ یہ کبھی شکایت کا موقعہ نہیں دیں گے۔'' میں نے جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔

''ہاں، آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں!'' کمل نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''نشیتھ جی، آپ گواہ ہیں! اگر بعد میں کچھ گڑ بڑ۔۔۔''

''آپ بے فکر رہیں!'' میں نے پھر اسے جھوٹی تسلی دی۔

''اچھا نشیتھ جی، پھر ملتے ہیں!'' یہ سنیتا کی آواز تھی۔ ان کی بس آ گئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد میں بھی اپنی رہائش کی طرف روانہ ہوا۔

رات میں کھانے کے بعد پڑھائی میں بالکل طبیعت نہیں لگی۔ سنیتا کا چہرہ ذہن میں ابھرتا رہا۔ وہ دہلی میں ہی کسی سرکاری دفتر میں ملازم تھی۔ اسی نے ایک بار بتلایا تھا کہ اس کے گھر میں ماں بھائی اور بھابھی ہیں۔ پتا جی پہلے ہی گزر گئے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال تھا سنیتا خوبصورت بھی نہیں تھی، پھر بھی کمل ناتھ کا اس پر دل آنا واقعی قابل تعریف بات تھی۔

اس بات کو دو مہینے ہو گئے تھے۔ ایک دن میں نے مورس نگر بس اسٹینڈ پر کمل کو ونتا کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے دیکھا۔ ونتا اپنے ہاتھوں سے کمل کو آئس کریم کھلا رہی تھی۔

''کیا حال ہے کمل جی؟'' میں نے چپکے سے جا کر پیچھے سے یہ سوال داغ

دیا۔

''ہاں آیئے نشیتھ جی آئس کریم کھایئے!'' کمل ناتھ مسکرا رہا تھا۔ پھر ونتا نے مجھے بھی ایک آئس کریم دی۔ میں نے بھی بدلے مین اسے ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ دوسرے دن سلوچنا نے بتایا تھا کہ کمل ناتھ کا دل ونتا نے بھی چرا لیا ہے۔

''لیکن دو لڑکیوں کے ساتھ ایک ساتھ عشق ۔۔۔ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''ہوسکتا ہے ہنیتا کے ساتھ صرف عشق کا اظہار کیا جا رہا ہو، اصل عشق ونتا کے ساتھ ہی ہو۔'' سلوچنا کی دلیل تھی۔

میں نے بھی سوچا کہ ونتا جیسی حسینہ کو نظر انداز کرنا کمل ناتھ کے لئے مشکل ہوگا۔ کمل کے لئے اس کے دل میں اٹڈ رہے پیار کو دیکھ کر کوئی بھی قیاس کر سکتا ہے کہ وہی کمل نکے گھر کی زینت بن سکتی ہے۔ ہم بھی دوستوں کی طرف سے اس کی محبت کی کامیابی کے لئے دعائیں کی جاتی رہیں۔ ابھی پچھلے ہفتہ کی ہی بات تھی 'ویلنٹائن ڈے' کے موقعہ پر ونتا ہم سبھوں کے لئے پاؤ بھاجی بنا کر لائی تھی۔ یونیورسٹی کے سوامی وویکانند کے مجسمہ کے نیچے سلوچنا، ریزکا، شیکھر اور کمل ناتھ کے ساتھ مجھے بھی ونتا نے بلایا تھا۔ پھر اپنے ہی ہاتھوں سے ونتا نے سب کو پاؤ بھاجی پیش کیا تھا۔ چاندنی چوک کی پاؤ بھاجی کا ویسے بھی کوئی جواب نہیں ہوتا

۔ونتا چاندنی چوک سے ہی تو روز آتی تھی۔وہاں وہ اپنی نانی کے پاس رہتی تھی۔

''ونتا کے ریسرچ ورک کی کیا صورت حال ہے؟'' میں نے سلوچنا سے بعد میں دریافت کیا۔

''اس کا تو سارا کام پچھلے ہفتہ ہی مکمل ہو گیا تھا۔لیکن۔۔۔۔''

''لیکن کیا؟''

''آجکل وہ کمل کے مقالہ کے لئے مواد جٹا رہی ہے۔''

''کیا کمل نے خود سے کچھ نہیں کیا؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔اس پر سلوچنا مسکرانے لگی۔اس کی مسکراہٹ میں ہی اس سوال کا جواب تھا۔آگے اس نے بتایا کہ آجکل کمل سول سروس کے کمپٹیشن کی تیاری میں لگا ہوا ہے۔لائبریری بھی نہیں آ رہا ہے۔رہائش پر ہی تیاری کر رہا ہے۔ونتا روز لائبریری میں آ کر اس کی ایم۔فل۔کا ڈسرٹیشن تیار کر رہی ہے۔

پچھلے اتوار کو دن کے بارہ بجے پٹیل چیسٹ بس اسٹینڈ پر مجھے پھر ونتا ملی۔اتنی گرمی میں دن کے بارہ بجے بس اسٹنڈ پر اس نازک دوشیزہ کا اس طرح تنہا بس کا انتظار کرنا مجھے بہت برا لگ رہا تھا۔پاس جا کر میں نے خیریت پوچھی،''ہائے ونتا!''

''ہائے نشیتھ جی!'' ونتا مجھے دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''بس دیکھ رہی تھی۔ایک گھنٹے سے بیٹھی ہوں ،ایک بھی نہیں آئی۔''

''چھوڑو، چلو میرے گھر۔میرے ساتھ لنچ کرو اور شام میں تمہیں بس میں بٹھا دوں گا۔اتنی گرمی میں اتنا نازک چہرہ جھلس جائے گا۔'' میں نے مذاق کیا۔ پھر وہ ہنسنے لگی۔اور میرے پیچھے چل پڑی۔میری رہائش پٹیل چیسٹ پر ہی ہے۔ اس لئے جلدی ہی گھر پہنچ کر میں نے کھانے کا انتظام کیا۔سبزی اور دال تو صبح ہی بنا رکھی تھی ۔جلدی ہی چاول کو کر میں بنایا۔اور ہاتھ منہ دھو کر ایک تھالی ونتا کے لئے اور دوسری خود کے لئے لگائی۔

کھانے کے بعد پھر اطمینان سے ونتا سے گفتگو ہونے لگی۔''اب بتاؤ کہاں گئی تھی! آج اتوار کو تو تم کبھی بھی لائبریری نہیں آتی۔پھر کس جانب۔۔۔''

''آپ تو جانتے ہی ہیں پھر بھی پوچھتے ہیں،کمل کے پاس گئی تھی۔''

''آج اتوار کو بھی۔۔۔۔۔''

''اس کا ایک سویٹر تھا وہ تیار ہو گیا تھا وہی دینے کے لئے گئی تھی۔''

''صرف سویٹر تھا یا اور کوئی بات تھی؟'' میں نے چھیڑنے کی کوشش کی۔پھر وہ شرما گئی اور سر نیچے کر لیا تھا۔میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ کمل کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتی۔اسی کو تو سچی محبت کہتے ہیں۔لیکن ایک سوال کافی دنوں سے میرے ذہن میں تھا۔میں نے وہ سوال بھی اس سے پوچھ ہی لیا؛''ایک بات بتاؤ ونتا! تم نے کبھی سوچا ہے کہ یہ کمل ناتھ تواری جی تمہارے ساتھ کتنی دور چل سکیں گے؟''

''جتنی دور قسمت میں لکھا ہوگا!''

''اس نے کوئی وعدہ کیا ہے؟''

''۔۔۔۔۔۔''اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''تم نے کچھ پوچھا نہیں؟''

''نہیں۔''

''دیکھو ونتا میں تمہیں جانتا ہوں، تمہارے دل میں کوئی چھل نہیں ہے۔ اگر تمہارے ساتھ کوئی بے وفائی ہوئی تو مجھے بہت تکلیف ہوگی۔''

''نشیتھ جی! آپ جیسے خیر اندیش دوست کی نیک خواہشات میرا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ ویسے میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا اسے میں اوپر والے کی مرضی سمجھونگی۔ میں محبت کی راہ پر نکل پڑی ہوں۔'' ونتا نے فیصلہ کن انداز میں اپنی بات رکھی تھی۔

''بھگوان تمہاری مدد کریں!'' میں نے کمل کے متعلق اپنا شبہ اپنے دل میں ہی چھپالیا۔ ابھی ونتا پر عشق کا جنون سوار تھا۔ وہ کچھ بھی سمجھنے کے لئے تیار نہیں تھی۔

''نشیتھ جی، پانچ بج گئے، اب چلئے بھی۔ کل پھر ملتی ہوں!'' اس نے گھڑی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ پھر میں اسے بس اسٹنڈ تک چھوڑنے گیا۔ اور بس میں بٹھا کر پھر واپس آگیا۔

اس کے بعد ونتا پھر نظر نہیں آئی۔ کسی نے بتایا کہ وہ اپنے گھر میرٹھ گئی ہے۔ کمل تو پہلے ہی سے نہیں تھا۔ وہ بھی گرمی کی چھٹیوں میں اپنے گھر گیا ہوگا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس بار جب کمل گرمی کی چھٹی ختم کرکے واپس آئے گا میں اسے ونتا سے شادی کے بارے میں جلد از جلد کوئی فیصلہ لینے کے لئے کہوں گا۔

''نشیتھ جی کیا سوچنے لگے؟'' سلوچنا ٹوسٹ لیکر ٹیبل پر آ گئی تھی۔

'' کچھ نہیں، ونتا کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ اس کا اب کیا ہوگا؟''

''ہوگا کیا! ہم سبھوں نے تو پہلے ہی اسے خبر دار کیا تھا لیکن تب تو اس پر عشق کا بھوت سوار تھا۔ کسی کی سن ہی نہیں رہی تھی۔'' سلوچنا کے لہجہ میں تھوڑی کڑواہٹ آ گئی تھی۔

''لیکن اس میں ونتا کا کیا قصور تھا؟''

''قصور کیوں نہیں، جب اسے پتہ تھا کہ انہیں دنوں اس کا سنیتا کے ساتھ بھی چکر چل رہا ہے۔ پھر بھی وہ امید کر رہی تھی کہ وہ اسے اپنے دل کی رانی بنائے گا۔ بے وقوف۔۔۔!''

''مجھے بھی لگ رہا تھا کہ۔ سنیتا، کمل اور پھر ونتا۔ اس 'تکڑی کون' کا بھلا کوئی اچھا انجام کیسے ہوسکتا ہے!''

''لیکن اس 'تکڑی' کا بہت ہی خوبصورت حل نکالا کمل کی ماں نے

سلوچنا نے کہا۔!''

'' کیسے؟''

''اس 'تکڑی' میں ایک کڑی اور جوڑ کر!''

''اچھا!''

''اور کیا! کمل کی شادی نہ تو ونتا کے ساتھ ہوئی اور نہ سنیتا۔ کے ساتھ ہی۔''

''پھر؟''

''کمل کی ماں کی ایک سہیلی ہے اسی کی بیٹی سے ہی تو ہوئی!۔'' سلوچنا نے بتایا۔

''بہت خوب! یعنی تکڑی کی جگہ معاملہ چوکڑی کا ہو گیا۔ بھائی واہ کمل!'' مجھے ہنسی آ گئی۔

''چلئے آپ کو ہنسی آ رہی ہے، مجھے تو دونوں پر غصہ آ رہا ہے! چلئے بس کا وقت ہونے والا ہے۔'' سلوچنا کرسی سے اٹھ گئی تھی۔

پھر ہم دونوں نے کافی ختم کی اور 'یو اسپیشل' بس اسٹینڈ کی جانب نکل پڑے۔ تھوڑی ہی دیر میں 'پرو بن روڈ' پر یو اسپیشل' آ گئی تھی۔ سلوچنا کو بٹھا کر ہاتھ ہلا کر اسے رخصت کر دیا۔ اس کی بس چل پڑی تھی۔ اور میں تنہا اپنی رہائش گاہ کی طرف بڑھنے لگا، ونتا کے غموں کا بوجھ اٹھائے۔

بدچلن

تعصب

کھگڑیا ضلع میں گنگا کے کنارے ایک بہت ہی پرانا گاؤں ہے۔ لیکن اس گاؤں کا نام ہے 'نیا گاؤں'۔ اسی گاؤں میں میں پیدا ہوا تھا۔ میرے پتا جی اور دادا جی بھی یہیں پیدا ہوئے تھے۔ اسی گاؤں میں ایک اسکول ہے 'شری کرشن ہائی اسکول' جس میں دس سال پہلے میرا داخلہ نویں کلاس میں ہوا تھا۔ اس سے پہلے پتا جی کے پاس ٹھاکر گنج میں ہی اپنی تعلیم ہوئی۔ وہاں شہر کے شور کو دیکھتے

ہوئے میں نے اپنے پرانے گاؤں میں آ کر اپنی اسکولی تعلیم مکمل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر میرے فیصلے کو پتا جی نے بھی مان لیا تھا۔

یہاں کے اسکول میں طلباً اکثر گاؤں کی زبان میں ہی استادوں سے گفتگو کرتے تھے۔ ٹھاکر گنج میں تو ہندی میں باتیں ہوتی تھیں۔ ویسے گاؤں کی زبان بھی میں اچھی طرح جانتا تھا لیکن زبان پر ہندی ہی چڑھی ہوئی تھی۔ مجھے سائنس اور حساب کی بجائے ہندی، انگریزی اور سنسکرت جیسے مضمون میں زیادہ دخل تھا۔ یہ بات اگلے امتحان میں میرے نتیجے نے ظاہر کر دیا تھا۔ لہذا سائنس اور حساب کے 'ٹیوشن' کے لئے استاد مقرر کیے گئے۔

اسکول کیمپس میں ہی دو اساتذہ 'ٹیوشن'، پڑھایا کرتے تھے۔ سنگھ صاحب حساب اور سائنس پڑھاتے تھے جب کہ ایشور صاحب انگریزی۔ میں نے سنگھ صاحب کے پاس 'ٹیوشن' پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے چھوڑ کر تمام دیگر طلباً ایشور صاحب کے پاس بھی جاتے تھے انگریزی پڑھنے۔ میرے چاچا جی کا بیٹا سنیت بھی وہاں جاتا تھا۔ ایک بار میں بھی اس کے ساتھ وہاں چلا گیا تھا۔ ایشور صاحب کی رہائش اسکول کے مین گیٹ کے پاس ہی تھی۔ جس وقت میں وہاں گیا اس وقت وہ ہندی کے کچھ جملوں کا انگریزی میں ترجمہ کروا رہے تھے۔ انہوں نے پہلے طلباً کو ہندی کے کچھ جملے لکھوائے۔ بعد میں ان کا انگریزی ترجمہ بنا کر انہیں دکھانا تھا۔ اتفاق سے میں نے بھی وہ تمام جملے لکھ لئے تھے اور

سب سے پہلے میں نے ہی ترجمہ کر کے ان کے سامنے پیش کیا۔ باقی طلباً نے ابھی ترجمہ کرنا شروع ہی کیا تھا ۔ یہ دیکھ کر ایشور صاحب بہت خوش ہوئے۔ تقریباً سبھی ترجمے صحیح تھے۔ باقی لڑکے بھی میری طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ بعد میں ایشور صاحب نے مجھے بھی اپنے پاس آنے کی دعوت دے دی جس کی کوئی فیس نہیں تھی۔

اسکول میں داخل ہوتے ہی داہنی طرف تھا ایشور صاحب کا کمرہ اور بائیں طرف ہیڈ ماسٹر صاحب کا گھر۔ دن کے ۹/ بجے تک دونوں اساتذہ اسکول میں ٹیوشن پڑھاتے تھے اور ساڑھے دس بجے سے اسکول شروع ہو جاتا تھا۔ تین چار مہینوں تک میری پڑھائی اچھی طرح چلتی رہی ۔ دونوں اساتذہ کے پاس بھی 'ٹیوشن' اچھی طرح چلتی رہی۔

ایک دن اچانک اس 'روٹین' میں ایک خلل پیدا ہو گئی ۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر میں ان کی دو بیٹیاں رہا کرتی تھیں ۔ بڑی بیٹی رجنی تھوڑی سانولی تھی لیکن چھوٹی بیٹی موہنی کے جلوؤں کا کوئی جواب نہ تھا۔ لہذا ہمارے اوپر موہنی کے موہ جال کا اس قدر اثر تھا کہ ہم نہ وقت دیکھتے تھے نہ جگہ، اپنی اپنی پڑھائی چھوڑ کر اس کی شربت دیدار کے لئے بے قرار رہتے تھے ۔ ان بے قراروں میں ایشور صاحب کے ٹیوشن والے طلباً کی تعداد زیادہ تھی ۔ اس میں ان کا ایک لائق فرزند بھی تھا۔ دراصل ایشور صاحب کے کمرے اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی رہائش

گاہ کے درمیان ایک کنواں تھا جہاں طلباً پانی پینے جایا کرتے تھے۔زیادہ تر پانی پینے کے بہانے موہنی کو دیکھنے جایا کرتے تھے۔

اس دن دسہرہ کا دن تھا۔ سبھی درگا کی مورتی کے وسرجن میں لگے ہوئے تھے۔ مجھے چوں کہ اس بات میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی لہذا میں باقی دنوں کی طرح اس دن بھی گھومنے کے لئے شام میں نکل گیا۔گھومتے گھومتے اسکول کی طرف ہی رواں ہوگیا۔اسکول کے گیٹ کے اندر دھیرے سے داخل ہوا۔وہاں دیکھا تو کنویں کے پاس موہنی چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی مانو کسی کا انتظار کررہی ہو۔ باقی پورااسکول سنسان تھا۔تمام کمرے بند تھے۔ سبھی لوگ 'درگا وسرجن' میں ہی گئے ہوئے لگ رہے تھے۔ مجھے تنہا اسکول میں داخل ہوتا ہوادیکھ کر وہ میرے پاس آ کر بولی، ''سنو!تم ہرروز کنویں پر آ کر مجھے کیوں دیکھتے رہتے ہو؟''

''پھر کیا ہوا؟'' مجھے کوئی اور جواب نہیں سوجھا۔

''تمہیں پتہ ہے،تمہارے پیچھے پیچھے کتنے اور بدتمیز لڑکے بھی مجھے دیکھنے کے لئے کنویں پر آتے رہتے ہیں؟''

''اس میں برائی ہی کیاہے،اگر کوئی تمہیں۔۔۔۔؟''

''کیا۔۔۔! مجھے کوئی اور دیکھے تو تمہیں کچھ نہیں ہوتا؟'' موہنی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ مجھے بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا کیا جواب دیا جائے۔ میں اس طرح کے جملے کے معنی سے تقریباًناواقف ہی تھا۔

''اچھا، اب یہاں سے جاؤ، پاپا کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ کل پانی پینے تو آؤ گے؟''

''پانی پینے۔۔۔؟''

''ارے کنویں پر!''

''اچھا، ضرور۔۔۔!'' اس کے پانی پینے کا مطلب مجھے اب سمجھ میں آیا۔

''لیکن اکیلے ہی آیا کرنا، ساتھ میں بھنوروں کی فوج مت لانا۔ تمہارے ساتھ اگر کوئی اور ہوا تو میں گھر سے باہر نہیں نکلوں گی۔ سمجھے؟''

''ٹھیک ہے!'' میں نے ہوا میں ہاتھ ہلاتے ہوئے اسے ہوائی بوسہ دیا۔ اور پھر گھر آ گیا۔ گھر آ کر ہاتھ پاؤں دھو کر پورنما سے باورچی خانہ کے متعلق دریافت کی۔ پورنما نے کہا ''سب کچھ ہے، صرف سرسوں تیل ختم ہو گیا ہے۔'' باورچی خانہ سے ہی پورنما نے کہا۔

''ٹھیک ہے ابھی لے کر آتا ہوں۔ اور تو کچھ نہیں۔۔۔؟''

''نہیں!'' یہ کہہ کر پورنما باورچی خانہ سے نکلی میرے ہاتھ میں ایک کٹوری رکھ دی۔

''ارے! کس نے لائے؟''

''پتا جی نے۔''

''واہ! میری بہن کتنی اچھی ہے!''

''اچھا ٹھیک ہے، زیادہ مکھن لگانے کی ضرورت نہیں ہے!'' پھر میں نے رسگلے کھائے اور پورنما سے پانی مانگ کر پیا۔ اور سرسوں کا تیل لینے کے لئے باہر نکل گیا۔ گاؤں کے ہی برج کشور چودھری لالہ کے یہاں سے ہم لوگ سامان خریدا کرتے تھے۔ وہاں سے سرسوں تیل اور ایک دو چھوٹی موٹی چیزیں جیسے صابن وغیرہ لیکر واپس چل پڑا۔ پورنما پچھلے کچھ مہینوں سے میرے ساتھ ہی رہ رہی تھی۔ پتا جی نے اسے میری مدد کے لئے یہاں بھیج دیا تھا۔ وہ باورچی خانہ سنبھالتی تھی اور میں اسکول۔ ابھی دسہرے میں ٹھاکر گنج سے پتا جی اور ماں بھی آئے ہوئے تھے۔

رات میں کھانا کھانے کے بعد میں سونے کے لئے مہمان خانہ کی طرف چل دیا۔ میرے محلے میں ایک بڑا سا مشترکہ مہمان خانہ تھا جہاں مہمانوں کے علاوہ تمام مرد سوتے تھے۔ مردوں کے علاوہ لڑکے بھی وہیں اپنی اپنی پڑھائی کرتے اور رات میں سو جاتے۔ میں بھی اپنے چچیرے بھائی سنیت کے ساتھ پڑھائی کرتا تھا اور رات میں وہیں سو لیا کرتا۔ میری اور سنیت کی الگ الگ میزیں تھیں۔ میزوں کے علاوہ شیلف اور لالٹین بھی علیحدہ تھیں۔

ویسے رات کے بارہ بجے تک میری اور سنیت کی پڑھائی چلتی تھی سنیت ان دنوں اپنی کلاس کی دو لڑکیوں کی محبت میں گرفتار تھا۔ آج میلے میں دونوں محبوباؤں سے اسکی ملاقات ہوئی ہوگی۔ لہذا آج اس کے جلد آنے کا کوئی امکان

نہیں تھا۔ میری بھی پڑھائی میں بالکل طبیعت نہیں لگ رہی تھی۔ لہذا میں نے جلدی ہی لالٹین بجھائی اور سو گیا۔

دوسرے دن پھر سے اسکول کھل گیا تھا۔ ایشور صاحب بھی چھٹی سے واپس آ گئے تھے۔ ہماری 'ٹیوشن' پھر سے شروع ہو گئی تھی۔ ٹھنڈ تھوڑی بڑھ گئی تھی۔ ہم نے 'سویٹر' نکال لیا تھا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ گاؤں کے ناٹک پریشد کے لئے رہرسل کا کام بھی شروع ہو گیا تھا۔ ناٹک پریشد کی جانب سے ہر سال دوالی کی رات دو ناٹک کھیلے جاتے تھے۔ اس سال سلطانہ ڈاکو' نام کا ناٹک کھیلا جانا تھا۔ مجھے ایک پیسے والے سیٹھ کا کردار دے دیا گیا۔ سنیت کو ناٹک کی ہیروئن کا کردار ادا کرنا تھا۔ لہذا ہماری پڑھائی میں دو پریشانیاں آ گئیں۔ ایک تو ہماری محبوبائیں اور دوسری یہ ناٹک۔

دوالی میں صرف دو ہی دن رہ گئے تھے۔ اسکول کسی وجہ سے دن کے بارہ بجے ہی بند ہو گیا تھا۔ تقریباً سبھی لڑکے لڑکیاں اسکول سے جا چکے تھے۔ میں بھی نکلنے لگا۔ مین گیٹ کے پاس جا کر تھوڑا سا موہنی کو ایک نظر دیکھنے کے لئے رکا۔ لیکن آج موہنی بالکل نظر نہیں آئی۔ ہاں فوراً پیچھے سے ایک آواز ضرور آئی'' پاٹیر! ذرا یہاں تو آنا!'' یہ آواز اشیور صاحب کی تھی۔

''جی ابھی آیا۔'' میں سیدھا ہیڈ ماسٹر کے دفتر کی طرف بڑھا۔ یہ بلاوہ ہیڈ ماسٹر کے دفتر کی طرف سے ایشور صاحب کا تھا۔

''وہاں کنویں کے پاس کیا کر رہے تھے؟''

''کچھ نہیں سر،تھوڑی پیاس لگی تھی،سوچا۔۔۔''

''آج کے بعد وہاں تم بالکل نہیں دکھو گے، سمجھے؟'' ایشور صاحب نے میری بات درمیان میں ہی کاٹتے ہوئے کہی۔

''جی اچھا!''

''ٹھیک ہے جاؤ!''

اور پھر میں اسکول سے گھر آ گیا۔ پورا دن سوچتا رہا آخر کس وجہ سے ایشور صاحب نے مجھے ٹوکا، صرف مجھے ہی۔ موہنی کو دیکھنے والوں میں تو اور بھی طلباً تھے۔ خود ان کا اپنا بیٹا مدن بھی تھا۔ لیکن کسی کو بھی انہوں نے کنویں پر جانے سے نہیں روکا۔ صرف میرے لئے ہی سخت رویہ کیوں۔ اس دن کے بعد میں نے ایشور صاحب کے یہاں کی ٹیوشن بھی بند کر دی۔ صرف سنگھ صاحب کی ٹیوشن چلتی رہی۔

دوالی کے موقعے پر گاؤں میں ناٹک کھیلا گیا۔ جس میں میرے کردار کو لوگوں نے کافی پسند کیا۔ چھٹھ تہوار کے بعد پتا جی اور ماں ٹھاکر گنج واپس چلے گئے۔ پورنما کو پتا جی نے میرے پاس چھوڑ دیا تھا۔ گاؤں کے وہ تمام لوگ جو باہر ملازمت کرتے تھے اپنے اپنے کاموں پر واپس لوٹ گئے۔ ہم سبھی طلباً پڑھائی میں پھر سے لگ گئے۔

بدچلن

مارچ میں ہمارا بورڈ کا امتحان تھا۔مہیش کھونٹ کا سردار پٹیل ہائی اسکول امتحان کا مرکز تھا۔ایک بیل گاڑی سے ہم سبھی امتحان والے طلباً برہم دیو بھیا کے ساتھ مہیش کھونٹ کے لئے روانہ ہو گئے۔بیل گاڑی پر ضروری سامان لاد دیا گیا۔وہاں بڑے بابو جی کے ایک دوست کے گھر پر ہمارے قیام کا انتظام کیا گیا۔سات دنوں تک ہمارے امتحان چلتے رہے۔

امتحان کے آخری دن جب ہم اپنا آخری پرچہ مکمل کر کے اسکول سے باہر نکل رہے تھے۔وہاں ایشور صاحب مل گئے۔وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ کچھ باتیں کر رہے تھے۔میں نے پیچھے سے جا کر پرنام کیا۔انہوں نے بڑی گرم جوشی سے امتحان کے متعلق پوچھا ''پاٹیر! کیسا رہا امتحان؟''

''سر! آپ کی دعاؤں سے سب کچھ ٹھیک ہی رہا۔''

''بہت اچھا!''

''یہ کون ہے؟'' ایشور صاحب کے دوست نے پوچھا۔

''یہ میرے اسکول کا وہ چراغ ہے جو مستقبل میں اسکول کا نام روشن کریگا۔ اس کا نام پاٹیر ہے یہ میرا بہت ہی پیارا طالب علم ہے۔'' ایشور صاحب کی یہ بات سن کر مجھے اس دن کی بات یاد آ گئی جس دن انہوں نے خشک لہجے میں مجھے کنویں پر جانے سے روکا تھا۔

''پاٹیر! اس کے بعد کیا پروگرام ہے؟'' ایشور صاحب نے پوچھا۔

''جیسا آپ حکم کریں گے میں تعمیل کروں گا۔''

''پھر بھی کچھ سوچا تو ہوگا؟''

''سوچ رہا ہوں اگر اچھا نتیجہ رہا تو اچھے کالج میں داخلہ لینے کی کوشش کروں گا۔''

''کس مضمون کو لے کر آگے بڑھو گے؟'' ایشور صاحب کے دوست نے پوچھا''

''میں بھی انگریزی ادب میں ہی آگے بڑھنا چاہتا ہوں، آخر استاد کی روایت کو بھی تو آگے بڑھانا ہے۔''

''بہت اچھے! مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے!'' ایشور صاحب نے کہا۔

''اچھا چلتا ہوں سر!'' پھر میں نے اجازت لی۔

''ٹھیک ہے، لیکن کبھی کبھی آ کر ملتے رہنا۔''

''جی، ضرور۔۔۔!'' یہ کہہ کر میں نکل گیا۔ راستہ میں برہم دیو بھیا تمام لوگوں کے ساتھ میرا انتظار کر رہے تھے۔

''کیا ہوا کہیں پھنس گئے تھے کیا؟'' برہم دیو بھیا نے پوچھا۔

''امتحان ختم ہونے کے بعد باہر ایشور صاحب مل گئے تھے۔ انہیں کے ساتھ باتیں کرتے کرتے آرہا تھا۔''

''خیر گاڑی پر بیٹھو سارا سامان پہلے ہی گاڑی پر رکھ دیا ہے۔ جلد ہی روانہ ہو

جانا ٹھیک رہے گا تا کہ رات ہونے سے پہلے ہی گھر پہنچا جا سکے۔''

اور پھر ہم لوگ برہم دیو بھیا کے ساتھ بیل گاڑی پر چڑھ کر اپنے گاؤں 'نیا گاؤں' کے لئے روانہ ہو گئے۔

امتحان کے بعد میں اور پورنما ٹھاکر گنج کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ پھر بارش کا موسم بھی شروع ہو گیا۔ ان دنوں ہم بہت مزے کرتے تھے۔ نہ پڑھنے کی کوئی فکر اور نہ کھانے کی۔ ماں اچھا اچھا کھانا پکا کر کھلاتی اور ساتھ میں دوست لوگ کیرم کھیلنے کے لئے آدھمکتے۔ ساتھ میں مکئی کے دانے چھڑانے والی عورتیں اپنے کاموں میں لگی رہتیں۔ کھیت سے بھٹے آتے اور کام کرنے والی عورتیں ان بھٹوں سے دانے چھڑاتیں۔ اس طرح دو تین مہینے نکل گئے۔ جون کے آخری ہفتہ میں ہمارے امتحان کا نتیجہ آیا۔ ٹھاکر گنج کے ہائی اسکول کے طلباً کے نتیجے بھی آ گئے تھے۔ صرف دو طلباً پہلے درجے میں کامیاب ہوئے تھے۔ لیکن نیا گاؤں سے اب تک کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ لہذا میں نے پھر ایک دن نیا گاؤں کا پروگرام بنایا۔ صبح کی بس سے پہلے پورنیہ اور پھر وہاں سے پروتا کے لئے دوسری بس لی۔ پروتا سے پھر تانگہ لے کر نیا گاؤں کے لئے روانہ ہوا۔ تانگہ میں اپنے گاؤں کا بھی ایک شخص داخل ہوا۔

''پرنام چچا! کہاں سے آرہے ہیں؟''

''خوش رہو بیٹے! بھاگلپور سے آرہا ہوں، چشمے کا گلاس بدلوانا تھا۔''

''اور گھر میں سب خیریت ہے؟''میں نے پوچھا۔

''بس سب بھگوان کی کرپا ہے۔۔۔ارے ہاں ، بیٹے بہت بہت مبارک ہو!''

''مبارک باد کس بات کی چچا؟''

''ارے تمہیں نہیں پتہ؟''

''نہیں تو۔۔۔!''میرا دل دھڑک رہا تھا۔کہیں میرے امتحان کے متعلق تو کوئی خبر نہیں ہے۔اگر نہیں تو پھر اور کس بات کی مبارک باد ہو سکتی ہے۔

''بیٹے،تمہارے امتحان کا نتیجہ آ گیا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن نتیجہ رہا کیسا؟''میری آواز میں تھوڑی جھلاہٹ تھی۔

''یہ تو نہیں بتا سکتا،لیکن کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ تم اور سنیت اچھے نمبروں سے پاس ہوئے ہو۔''

میرے اس چچا جان کی زیادہ تعلیم نہیں تھی لہذا ان کی اس موضوع پر زیادہ دلچسپی بھی نہیں تھی۔ چھ بجے تک میں گاؤں پہنچ گیا۔گاؤں کے پاس ہی لگے برگد کے درخت کے پاس کئی لوگ میرے استقبال کے لئے آ گئے تھے۔

''آؤ پاٹیر!اب تو تمہاری طرف سے رسگلے کی بارش ہونی چاہئے!''برہم دیو بھیا نے آگے بڑھ کر کہا تھا۔

''کیا ہوا؟''مجھے معلوم تھا کہ یہ خوشی کا ماحول میرے امتحان کے نتیجہ کے

متعلق ہی ہو سکتا ہے۔ پھر بھی انجان بنتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا، پوچھو کہ کیا نہیں ہوا!'' سوداگر بابو کی آواز تھی۔

''آخر بتلائیے تو صحیح ہوا کیا، یہاں سبھی خوش دکھائی دے رہے ہیں۔''

''بھئی، تم اور سنیت دونوں ہی اس بار پہلے درجہ میں کامیاب ہوئے ہو۔'' مہیش بھیا نے اطلاع دی۔ مجھے فوراً یقین نہیں ہوا لیکن پروردگار کے فیصلے پر گہری سانس لی میں نے۔ برگد کے درخت کے پاس کنویں پر پاوں ہاتھ دھو کر تھوڑی دیر گپ شپ ماری اور اسی درمیان بڑی ماں کی طرف سے برجیش پیغام لایا کہ رات کا کھانا تیار ہے فوراً آ کر کھا لیں۔ پھر بڑی ماں اور بڑے بابو کے پاؤں چھو کر کھانا شروع کیا۔

''آج بھائی جی نے اپنے خاندان کا نام روشن کیا ہے۔'' یہ میرے متعلق انو رادھا کی آواز تھی۔

''آخر بیٹا کس کا ہے!'' بڑی ماں نے نہلے پر دہلہ ٹھونکا۔

''کل ایشور صاحب کی طرف سے کوئی لڑکا آیا تھا۔ تمہیں پوچھ رہا تھا۔'' بڑے بابو جی نے بتایا۔

''ٹھیک ہے کل ملنے جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر میں پھر منجھلے بابو اور موسی سے بھی ملنے چلا گیا۔ ان کی دعائیں بھی لیں۔ اور رات میں کافی دیر تک میرے اور سنیت کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ کافی دنوں کے بعد خاندان میں کسی نے پہلے

درجے میں میٹرک پاس کیا تھا۔ لیکن اس کامیابی کا سہرہ ایشور صاحب کو جاتا ہے جنہوں نے مجھے موہنی کے اندر جال سے نکالا تھا۔ آج مجھے کافی افسوس ہوا اپنی بے وقوفی پر جب میں نے ایشور صاحب کی نیت پر شک کیا تھا۔ سچ میں استاد کبھی بھی کسی طالب علم کے متعلق متعصب نہیں ہوسکتا۔ یہی سوچتے سوچتے سو گیا۔

بدچلن

گندہ لباس

میں نے آخرکار فیصلہ کر ہی لیا۔ کل جا کر مدھومتا کے سامنے شادی کی تجویز پیش کر دوں گا۔ گھر میں چاہے جو بھی ردعمل ہو، دیکھا جائےگا۔ معاشرے میں کئی مدھومتائیں بھٹک رہی ہیں جن کی کوئی شناخت نہیں کوئی مستقبل نہیں۔ ان تمام لڑکیوں میں سے اگر کسی ایک کے بھی میں کام آ سکا تو میں سمجھوں گا کہ میری زندگی کا بھی کوئی معنی ہے۔ اور اس قدم سے پتا جی کا سر اونچا ہی ہوگا ان کی

رسوائی تھوڑے ہی ہو سکتی ہے۔

دہلی کے سوامی شردھا نند مارگ پر ایک مشہور طوائف خانہ ہے۔ وہاں نہ جانے کتنی ہی طوائفیں سالوں سے جسم کی تجارت میں منسلک ہیں۔ ان میں کچھ تو ایسی ہیں جو برائے شوق اس میں شامل ہوتی ہیں اور کچھ مجبور ہو کر آتی ہیں۔ کچھ تو ایسی بھی جنہیں زبردستی اس آگ میں جھونک دیا جاتا ہے۔ ایک بار جو پھنسی تو پھر نکلنا مشکل۔ ایسی ہی تھی ایک طوائف جانکی بائی۔ اٹھارہ سال پہلے وہ بھی کسی کے گھر کی زینت تھی۔ اس کی بھی شادی ہوئی تھی۔ جب وہ اپنے شوہر کو ڈھونڈنے کے لئے دہلی آئی تو اسے شوہر تو نہیں ملا۔ ملی رسوائیوں کا تحفہ۔ اسے کسی نے شوہر کو ڈھونڈ نکالنے کا وعدہ کر کے ایک طوائف کے کوٹھے پر بٹھا دیا۔ پھر کچھ ہی دنوں بعد اپنے گھر والوں سسرال والوں اور تمام رشتہ داروں سے جانکی کٹ گئی تھی۔ وہیں اس نے مدھومتا کو جنم دیا تھا۔ اپنے شوہر کی نشانی کو۔ اور وہی مدھومتا آج میرے کالج میں بی۔ اے۔ سال دوئم کی طالبہ ہے۔

مدھومتا سے تعارف کی داستان بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔ پچھلے سال کالج کے پاس کے کملا نگر کے ایک ریسٹورنٹ میں ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔ وہاں در اصل ایک میز پر کافی کا میں انتظار کر رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہاں ایک خوبصورت سی دوشیزہ تھکی ہوئی نظر نواز ہوئی۔ شام میں کملا نگر کے ریسٹورینٹوں میں عموماً بڑی بھیڑ رہتی ہے۔ اس ریسٹورنٹ میں ایک بھی میز خالی نہیں تھا۔ صرف

میرے میز پر ایک کرسی خالی تھی۔ میری طرف اس نے اس انداز سے دیکھا جیسے یہ کہنا چاہ رہی ہو اگر آپ کی اجازت ہو تو میں بھی بیٹھ جاؤں۔ میں نے بھی آنکھوں سے ہی اشارہ کر دیا تھا۔ بریڈ رول کے ساتھ کافی ختم کر کے وہ جلدی ہی اٹھ گئی اور کاؤنٹر پر جا کر بل ادا کرنے لگی۔ میری بھی کافی ختم ہو چکی تھی۔ میں بھی کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا تھا۔ وہاں جا کر دیکھا تو وہ دوشیزہ وہاں چپ چاپ کھڑی تھی۔ میں نے اس کے ماتھے پر پڑتے بل کو دیکھ کر پوچھا، ''کیا بات ہے، آپ کچھ پریشان سی لگ رہی ہیں؟''

''جی۔۔۔!'' اس سے زیادہ اس کی زبان سے کچھ نہیں نکلا۔

''آپ بے ہچک کہئے، میرے لائق کوئی خدمت۔۔۔؟'' میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اپنا پرس لانا بھول گئی ہے۔

''جی، میرا پرس لائبریری میں ہی چھوٹ گیا ہے۔۔۔''

''خیر کتنا دینا ہے؟'' میں نے اپنا پرس اس کے سامنے کر دیا۔

''جی، صرف پندرہ روپے'' اس نے ایک دس اور ایک پانچ کا نوٹ نکال کر کاؤنٹر پر جمع کر دیا تھا۔ اور پھر میں اس کے رسمی 'شکریہ' جیسے الفاظ کا انتظار کئے بغیر لائبریری کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اس کے بعد کئی مہینے گزر گئے۔ میرے امتحان کا وقت بھی قریب آ گیا تھا۔ ہماری پڑھائی زوروں سے چلنے لگی تھی۔

ایک دن کالج کی لائبریری کے پیریوڈیکل سیکشن میں بیٹھ کر کسی رسالے کو

دیکھ رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی 'ہیلو!'' میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہی لڑکی تھی جس نے کملانگر کے ریسٹورنٹ میں مجھ سے پندرہ روپے لئے تھے۔ ''ہیلو!'' میں نے بھی اس کی ہیلو' کا جواب دیا تھا۔

''کیا مجھے بھول گئے؟''

''نہیں تو!''

''جی میں مدھومتا ہوں ۔ یہاں بی۔اے۔ انگریزی آنرز سال آخر میں ہوں۔''

''بہت اچھا!''

''اگر آپ کو پریشانی نہ ہو تو دس منٹ کے لئے باہر لان میں بیٹھیں؟''

''ہاں ، ہاں ! کیوں نہیں ! ابھی چلتے ہیں۔'' اس کی باتوں میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ میں اسے منع نہ کر سکا۔ اور ہم لائبریری کے باہر لان میں بیٹھ گئے ۔ گفتگو کا سلسلہ مدھومتا نے ہی شروع کیا۔ ''اس دن کملانگر میں میں آپ کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی۔''

''ارے شکریہ میں کیا رکھا ہے، انسان انسان کے کام آئے یہ بات زیادہ اہم ہے۔''

''پھر بھی اس دن اگر آپ نہ ہوتے تو میری عزت کا۔۔۔''

''ارے یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ، اس وجہ سے مجھے آج آپ جیسی ایک

بدچلن

دوست تو ملی''

''یہ میری خوش قسمتی ہے۔لیکن اس خوش قسمت کواب تک آپ کا نام پتہ نہیں چلا!''

''اس خاکسار کو اتکرش چترویدی کہتے ہیں ! آپ کے ہی کالج میں ایم۔اے سال اول کا طالب علم ہوں۔''

''تب تو ہم دونوں ایک ہی کالج میں ہیں !۔تو اپنی دوستی کی شروعات کیوں نہ ہم ایک ایک کپ کافی کے ساتھ کریں؟''

''ضرور!'' میں نے بھی اس کی تجویز کو قبول کر لیا تھا۔کروری مل کالج دہلی یونیورسٹی کے چند بہت ہی جانے مانے کالجوں میں سے ایک ہے۔اس کالج کا کینٹین بھی بہت خوبصورت ہے۔اس درمیان مدھومتا کینٹین جا کر دو کافی لے آئی اور ہم لان میں ہی بیٹھ کر کافی پینے لگے۔کافی کے درمیان اس نے اپنا پالی تھین والا لفافہ کھولا جس میں سینڈوچ وغیرہ تھے۔اس نے نکال کر سب کچھ مجھے پیش کیا۔پھر ہم دونوں ہی کھانے لگے۔کافی دیر تک ہم دونوں محو گفتگو رہے۔ اسی درمیان کچھ بھیک مانگنے والی لڑکیاں آگئیں اور 'جوڑی سلامت رہے' جیسی دعائیں تقسیم کر کے کچھ پیسے مانگنے لگیں۔میں نے جان چھڑانے کی غرض سے دو روپے کا ایک سکہ ایک لڑکی کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔مدھومتا کے رخسار شرم سے لال ہو رہے تھے۔اس نے سر جھکائے ہوئے ہی مجھ سے کہا''اتکرش جی ، میں

نے آپ کا بہت وقت لے لیا ہے، آپ پڑھائی میں مشغول تھے!''

''پھر ملتے ہیں!'' میں نے بھی اجازت لے لی تھی۔

''پھر ملاقات تو ہوگی نہ؟''

''ضرور! میرے لائق اگر کوئی خدمت ہو تو ضرور کہیے گا۔''

''بہت بہت شکریہ؟''

اس پہلی ملاقات کے بعد پھر ہماری ملاقات اکثر ہونے لگی۔ کبھی لائبریری میں، کبھی لان میں تو کبھی کملانگر میں ہم مل ہی لیتے تھے۔ دھیرے دھیرے ایک سال گزر گیا۔ ہمیں پتہ ہی نہیں چلا کہ کب ہم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔

آج اتوار تھا۔ ہاسٹل مین صبح ۹ ر بجے تک ناشتہ لے کر مال روڈ کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں سے بس لے کر سوامی شردھانند مارگ، کی جانب نکل گیا۔ وہاں سے مدھومتا کو لے کر پھر انڈیا گیٹ کی طرف چل پڑا۔ وہاں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکنے لگے۔

''آج دیر کیوں ہوئی؟''

''بھئی، بس میں آنا پڑتا ہے کوئی اپنی گاڑی تو ہے نہیں! دیر تو ہو ہی سکتی ہے!''

''چلو، جھوٹے کہیں کے!''

''یار ۹ ر بجے تو ہاسٹل میں ناشتہ سے ہی فارغ ہوا؟''

''اچھا! آج ناشتہ میں کیا بنا تھا؟''

''ہاسٹل کے کھانے کے متعلق تو تمہیں پتہ ہی ہے۔ کھانا کیا سمجھ لو دال اور سبزی ابال کر تھالی میں ڈال دیتے ہیں۔ کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں!''

''پھر کھاتے کیسے ہو؟''

''کیا کروں پیٹ کی آگ تو بجھانی ہی ہے!''

''کاش! کبھی میں تمہارے لئے اپنے ہاتھ سے کھانا بناتی اور اپنے ہاتھوں سے۔۔۔''

''پھر؟''

''۔۔۔نہیں، کچھ نہیں!'' مدھومتا نے اپنی بات درمیان میں ہی ختم کر دی۔

''مدھو! میں جانتا ہوں تمہارے دل کی بات۔ اسی لئے آج ایک تجویز لے کر آیا ہوں۔''

''تجویز! کون سی تجویز؟''

''میں چاہتا ہوں کہ تم تاعمر مجھے اپنے ہاتھوں کا بنا کھانا کھلاؤ۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو اتکرش!''

''ہاں مدھو! کل میں یہ تجویز اپنے پتا جی کے سامنے رکھنے والا ہوں۔ اس کے پہلے تمہاری رضامندی چاہتا ہوں۔''

گندہ لباس

''اتکرش، کیا تم بھول گئے کہ میں ایک طوائف کی بیٹی۔۔۔''

''جانتا ہوں، سب جانتا ہوں، پر میں پوچھتا ہوں کہ ایک طوائف کیا انسان نہیں ہوتی؟''

''اتکرش، تم نہیں جانتے، لوگ تمہیں جینے نہیں دیں گے۔'' مدھومتا نے ڈرتے ہوئے کہا۔

''مدھو میں نے ماں سے پہلے ہی اس کے متعلق ذکر کر رکھا ہے، پتہ ہے انہوں نے کیا کہا؟''

''ماں جی کیا کہتی ہیں؟''

''انہوں نے کہا کہ طوائف بھی انسان ہوتی ہے۔ وہ تو صرف اپنا جسم فروخت کرتی ہے۔ لوگ تو اپنی روح تک بیچ دیتے ہیں۔ نہ جانے بچاری کس مجبوری سے اس مقام تک پہنچی ہو۔ تم بے فکر رہو۔ اگر تم مدھومتا کو چاہتے ہو تو میں اپنے گھر میں اس کا استقبال کروں گی۔''

''سچ؟'' مدھومتا کو جیسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

''اور کیا!''

اور پھر وہ مجھ سے لپٹ گئی اور کافی دیر تک لپٹی ہی رہی۔

☆

رُخصتی

آج صبح ہی گاؤں میں خبر پھیل گئی کہ سنتو کی گھر والی کا انتقال ہو گیا۔ کسی نے بتایا کہ وہ کئی مہینے سے بیمار تھی، کل رات ہی وہ چل بسی۔ ہم سب کو بہت دُکھ ہوا تھا، سنتو کی گھر والی شانتی کا ہمارے گھر سے ایک نہ ٹوٹنے والا رشتہ جو تھا۔ مجھے بارہ سال پہلے کا وہ حادثہ پھر سے یاد آ گیا۔

میں اور میرے بھیاؔ اُن دنوں کافی چھوٹے تھے سنیتا اور سلیکھا بھی بہت

چھوٹی تھیں ماں ہی گھر کا سارا کام کرتی تھیں ۔والدکھیتی باڑی کرتے تھےاور شہر کے ایک سنیما ہال میں بھی ان کا حصہ تھا۔اسی سنیما ہال کی وجہ سے رات میں وہ کبھی کبھی کافی دیر سے لوٹتے تھے ۔اس رات بھی وہ پڑوس کے ایک چچا کے ساتھ دیر سے لوٹ رہے تھے۔تھوڑی دیر بعد انہیں لگا کہ کوئی ان کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔اندھیری رات تھی ۔انہوں نے ٹارچ جلا کر دیکھا تو ایک خوبصورت لڑکی ہانپتے ہوئے ان کے پیچھے بھاگی چلی آ رہی تھی۔انہوں نے اس سے پوچھا ''کون ہوتم ؟ کہاں سے آ رہی ہو؟'' لیکن اس لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔پھر چچا نے پوچھا'' کہاں جانا ہے؟:: اس پر بھی لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا'' لگتا ہے گھر سے بھاگ کر جارہی ہے کہیں'' چچا نے والد کے کان میں دھیرے سے کہا ''خیر! کوئی بات نہیں، چلو بیٹی میرے ساتھ چلو'' والد یہ کہہ کر اسے اپنے ساتھ گھر لے آئے تھے ۔پھر ماں نے اسے کھانا کھلایا دوسرے دن جا کر وہ کچھ نارمل ہو پائی تھی ماں نے اس سے پوچھا:

''تمہارا نام کیا ہے بیٹی؟''

''جی شانتی''

''کیا ہوا، گھر سے کیوں چلی آئی ؟''

شانتی تفصیل سے بتانے لگی ،اس کے مطابق کٹیہار ضلع میں ایک گاؤں ہے نریندر پور اس کے والد بدھن وہاں کے ایک زمیندار کے یہاں کام کرتے تھے۔

اس کی والدہ نے سات بیٹیوں کو جنم دیا تھا شانتی ان کی پہلی اولاد تھی جب وہ پندرہ سال کی ہوئی تو اس کے والد کو شانتی کی شادی کی فکر ہوئی۔ ایک تو غریبی اوپر سے سات بیٹیاں۔ وہ اسی سوچ میں ڈوبے رہنے لگے۔ دن، مہینے اور سال گزرتے گئے۔

ان کا ایک ساتھی تھا جس کا نام تھا سکھدیو وہ عمر میں تو ان سے کافی چھوٹا تھا لیکن زمیندار کا منہ لگا ہونے کی وجہ سے کافی ترقی کر گیا تھا وہ ان دنوں زمیندار کا منشی بنا ہوا تھا۔ اس کی بیوی چار بیٹے پیدا کر کے چل بسی تھی۔ اس کا سب سے بڑا لڑکا سندیپ ایک مقامی کالج میں بی۔ اے۔ کر رہا تھا اور آخری سال میں تھا۔

ایک بار والد نے اسی سکھدیو سے میری شادی کے بارے میں بات کی:

''بھیا! اگر تم چاہو تو شانتی کی شادی ہو سکتی ہے''

''کیسے؟''

''تم مالک کے بہت قریب ہو۔ اگر تم ان سے میری سفارش کر دو تو وہ تھوڑی مدد کر دیں گے۔''

''ٹھیک ہے میں کہہ دوں گا۔''

یہ سن کر والد گھر چلے آئے اور میری والدہ کو یہ بات بتائی۔ پھر دونوں میری شادی کے بارے میں باتیں کرتے کرتے سو گئے۔

دوسرے دن شام کے قریباً سات بجے سکھدیو ہمارے گھر پہنچا والد بہت

خوش تھے۔ والدہ نے اسے بہت اچھا کھانا کھلایا پھر پینے پلانے کا بھی دور چلا رات کے دو بج چکے تھے والد کو انتظار تھا کہ شاید آج سکھد یو ان کے لئے کوئی اچھی خبر لایا ہے۔ انہوں نے پوچھ ہی لیا:

''ہاں بھئی سکھو! مالک سے کوئی بات ہوئی؟''

''دیکھو بدھن، ! تم تو جانتے ہی ہو کہ میں مالک کے بہت ہی قریب ہوں۔ کوئی پریشانی نہیں ہے۔''

''بالکل صحیح ہے'' والد نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''یہ بھی سچ ہے کہ سندیپ کی ماں کے نہ رہنے سے گھر کا کام نہیں چل رہا۔''

''ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' والد کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ ان کی شانتی کے لئے سکھد یو اگر اپنے بیٹے سندیپ کے لئے خود ہی رشتہ مانگ رہا تھا تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ سندیپ تو پڑھا لکھا بھی تھا۔

''تمہیں یہ بھی پتہ ہے کہ شانتی کی شادی کے لئے بہت سے روپیوں کی ضرورت ہوگی۔''

''اور کیا!''

''تو پھر شانتی سے شادی کرنے کے لئے میں تیار۔۔۔''

''کیا۔۔۔! شانتی سے۔۔۔''

''ہاں بدھن، اگر ہم دونوں رشتہ دار بن جائیں تو ہم دونوں کے مسائل کا

حل نکل آئے گا۔''

''کمینے! تمہیں یہ کہنے کی ہمت کیسے ہوئی؟'' والد کی آنکھیں غصے سے لال ہو رہی تھیں۔

''سوچ لو!'' سکھدیو کی آنکھوں سے بے شرمی جھانک رہی تھی۔

''شیطان! یہ تمہاری شادی کی عمر ہے؟ چل بھاگ یہاں سے اور اسی وقت''

''ابھی تو میں جا رہا ہوں لیکن کل پھر آؤں گا۔ تب تک تم ٹھنڈے دل سے سوچنا ایسا سنہرا موقع پھر نہیں ملے گا'' یہ کہہ کر سکھدیو ہمارے گھر سے چلا گیا اور کہیں اندھیرے میں گم ہو گیا۔ والد کو رات بھر نیند نہیں آئی اپنی غریبی پر خود کو کوستے رہے۔ دنیا میں انسان کو تمام روگ لگ جائیں لیکن مفلسی کا روگ نہ لگے۔ اسی فکر میں ساری رات گزر گئی۔ صبح وہ اٹھے اور سکھدیو نے جو کہا تھا، سب والدہ کو بتا دیا۔

''کیا! اس بدمعاش کی یہ ہمت!'' والدہ کو بھی غصہ آ گیا تھا۔

''پھر کیا کہا تم نے؟''

''میں نے غصے میں اسے بھگا تو دیا ہے۔۔۔۔''

''پھر۔۔۔!'' والدہ بھی کچھ نرم پڑ گئی تھیں۔

''کوئی اور راستہ بھی تو نہیں سوجھتا، کیا کروں؟''

''چلو، اوپر والے کو شاید یہی منظور ہے۔'' یہ کہتے ہوئے والدہ نے بھی

رخصتی

ہتھیار ڈال دیے تھے۔

اس طرح سکھدیو سے میری شادی کردی گئی۔ گھر کے سبھی لوگوں نے اداس دل سے مجھے رخصت کیا میری اور سکھدیو کی جوڑی کو کسی نے بھی پسند نہیں کیا تھا لیکن گاؤں کے تمام لوگ رسماً مجھے رخصت کرنے آئے تھے والد، والدہ اور میری چھ بہنوں کی آنکھوں میں آنسو تھے، خوشی کے نہیں بلکہ غم کے۔

میں اپنے نئے گھر میں داخل ہو چکی تھی لیکن وہاں کوئی بھی میرا استقبال کرنے کے لئے موجود نہیں تھا۔ نہ سسر تھے اور نہ ہی ساس میں خود ہی گھر میں داخل ہوئی، پانی پیا اور رسوئی میں گھسنے والی تھی کہ پڑوس کی ایک چچی نے آکر کھانا لگا دیا۔ شام چار بجے جب سارے بچے اسکول سے واپس آئے تو گھر میں ایک نئی دلہن کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پندرہ سال کا سنگیت پوچھ ہی بیٹھا:

''ہاں بھئی، تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟''

''یہ میرے شوہر کا گھر ہے'' میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔

''اچھا! یہ تمہارے شوہر کا گھر کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی تو سندیپ بھیا کی شادی ہی نہیں ہوئی ہے۔ کہیں تم غلطی سے کسی دوسرے گھر میں تو نہیں آ گئیں؟''

''بیٹا! یہ تمہاری ماں ہے میں اسے لایا ہوں۔'' اسی وقت سکھدیو گھر میں داخل ہوا۔

''کیا یہ آپ کی شادی کی عمر ہے؟ کبھی اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا ہے آپ

نے؟ کہیں آپ پاگل تو نہیں ہو گئے ہیں؟''

''نہیں بیٹا! اپنے گھر میں، گھر کے کام کاج کے لئے ایک عورت کی ضرورت تھی۔اس لئے۔۔۔''

''گھر کے کام کاج کے لئے یا اپنے کام کاج کے لئے۔سنگیت کو بہت غصہ آ گیا تھا۔

''اے لڑکی! کل صبح جہاں سے آئی ہے، وہیں واپس لوٹ جانا ورنہ دھکے دے کر نکال دوں گا سمجھیں؟'' یہ کہہ کر وہ اپنے بڑے بھائی سندیپ کو تلاش کرنے چلا گیا۔سکھدیو کو بھی زمیندار کا بلاوہ آ گیا تھا۔

رات ہو چکی تھی۔دونوں چھوٹے بچے بغیر کچھ کھائے ہی سو گئے تھے۔گھر میں اس وقت صرف میں تھی جو اپنی قسمت پر آنسو بہانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔والد کے گھر سے تو نکالی جا چکی تھی، اب شوہر کے گھر سے بھی نکلنے کی نوبت آ گئی تھی۔سوچ رہی تھی، اب کہاں جاؤں، اگلا پڑاؤ تو موت ہی ہو سکتا تھا۔لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ موت کو گلے نہیں لگاؤں گی، میں جینا چاہتی تھی۔صبح چار بجے ہی میں گھر سے نکل پڑی تھی نہ کوئی منزل تھی اور نہ ہی ٹھکانہ۔

یہ کہتے کہتے شانتی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔والدہ نے اسے گلے لگا کر ڈھارس بندھائی اور کہا:

''بیٹا، فکر نہ کرو! ہم لوگ تمہاری پھر سے شادی کروائیں گے۔سب ٹھیک ہو

جائے گا۔''

''اب مجھ سے شادی کون کرے گا ماں!'' شانتی کی آنکھوں سے جیسے سمندر پھوٹ پڑا تھا گھر کے سبھی لوگوں نے اسے دلاسہ دیا۔

آہستہ آہستہ وہ ہمارے خاندان کا ہی ایک حصہ بنتی چلی گئی۔ مجھے بھی لگا کہ میری دو نہیں بلکہ تین بہنیں ہوگئی ہیں۔اس نے بھی بڑی بے تکلفی سے گھر کا سارا کام سنبھال لیا تھا۔

وقت گزرتا رہا اسی دوران گاؤں میں کسی نے بتایا کہ سنتو کی بیوی ایک بیٹے کو جنم دے کر مرگئی۔ اب اس کے چھوٹے بچے کی پرورش کا مسئلہ درپیش تھا۔ کسی نے اسے شانتی کے بارے میں بتادیا۔ ہمارے والد کا اشارہ پاتے ہی ایک دن وہ گھر چلا آیا۔ یوں تو گاؤں میں سبھی سنتو سے واقف تھے، پھر بھی والد نے اس سے پوچھ ہی لیا:

''دیکھو سنتو! تم تو جانتے ہی ہو، شانتی میری پیاری بیٹی ہے۔اس کے بارے میں تمہیں سب کچھ معلوم تو ہو ہی گیا ہوگا۔ کیا تم اسے خوش رکھ سکو گے؟''

''چچا! آپ سے میرا بھی تو کچھ چھپا ہوا نہیں ہے غریب آدمی ہوں۔تھوڑی بہت کھیتی کی زمین ہے۔اس سے کھانے کا سال بھر کا اناج ہو ہی جاتا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کی بیٹی اس حقیر کے گھر میں خوش رہے گی۔''

سنتو نے بھروسہ دلایا تو ہم لوگ پوری طرح سے مطمئن ہو گئے۔ایک دن

نہایت سادگی سے شانتی کی سنتو سے شادی کردی گئی ۔ہم سبھی بھائی بہنوں نے بھرے دل سے شانتی کو رخصت کیا تھا شانتی کی آنکھیں بھی نم تھیں ۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

آج جب اسی شانتی کی موت کی خبر آئی تو سب کا دل بھر آیا۔فرطِ غم میں والد کھانا نہیں کھا سکے ۔ ماں بھی فوراً سنتو کے گھر کی طرف چل دی ۔ میں سمجھ نہیں پایا،آخر مصیبتوں کے لئے کیا صرف شانتی ہی ملی تھی اوپر والے نے اس کے حصہ کی کچھ پریشانیاں میری جھولی میں کیوں نہ ڈال دیں ۔شانتی نے سنتو کا گھر خوشیوں سے بھر دیا تھا۔اب وہ چار بیٹوں کا باپ تھا کہنے کو یہ بیٹے آگے چل کر سنتو کا سہارا بنیں گے مگر۔۔۔کل۔۔۔آنے والا کل کس نے دیکھا ہے؟

بدچلن

۲۲ر تاریخ کو بھیا کی شادی طے ہوئی ہے۔ مختلف جگہوں سے دوستوں رشتہ داروں کی آمد شروع ہوگئی ہے۔ اب شادی میں صرف تین دن رہ گئے ہیں۔ کل ماماجی بھی آجائیں گے۔ انہیں کے ساتھ کل مجھے بھیا کی سسرال جانا ہے۔ شادی کے دو دن پہلے لگن کی رسم مکمل کرنے کے لئے دولہے کے کنبے سے دو تین لوگوں کا دلہن کے گھر جانا ضروری تھا۔

شام کے پانچ بج رہے تھے۔ چائے کے ساتھ شادی کی تیاریوں کے متعلق گفتگو چل رہی تھی ۔ دعوت نامہ بھیجنے کا کام میرے ذمہ تھا۔ اس کے متعلق بھی ماں سے مشورے کا دور چل رہا تھا۔ کوئی اہم نام چھوٹ نہ جائے اس کا خاص خیال رکھا جا رہا تھا۔ باہر کے جتنے بھی رشتہ دار تھے انہیں تو پہلے ہی دعوت نامے روانہ کر دئے گئے تھے۔ صرف مقامی لوگوں کے کارڈس رہ گئے تھے۔ کل انہیں بھی تقسیم کر دئے جانے کی توقع ہے۔ ابھی اسی موضوع پر تبادلہ خیال چل رہا تھا کہ آنگن میں ایک خوبصورت خاتون داخل ہوئی۔ 'یہ کون ہو سکتی ہے' یہ اندازہ لگا نا مشکل ہو رہا تھا۔' ویسے چالیس کی عمر تو ہو گی ہی۔ لیکن چہرے کی چمک کو دیکھ کر عمر کا صحیح قیاس کرنا مشکل تھا۔

''پرنام نلن جی!'' وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

''پرنام!'' میں نے بھی پہچاننے کی کوشش کی۔

''مجھے پہچان رہے ہیں یا بھول گئے؟'' اس نے قتل کرنے والے انداز میں کہا۔

''ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔پہچان گیا۔ آپ ہماری بھابھی۔۔۔''

''بہت دیر سے پہچانا۔ ہٹئے، یہ میری کرسی ہے'' وہ مجھ سے کرسی چھین کر خود ہی اس پر بیٹھ گئی۔ میں نے پھر نرملہ کو آواز دی ''اری نرملہ! بھابھی جی کے لئے چائے لاؤ'' اور یہ کہہ کر میں گھر کے اندر جا کر اپنا کام مکمل کرنے لگا۔ دعوت

نامے پر نام اور پتے لکھنے تھے۔ تھوڑی دیر میں کام کرتا رہا لیکن بار بار یہ خوبصورت خاتون ذہن میں داخل ہو جاتی۔ اسی درمیان ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ماں نے برآمدے سے اندر داخل ہو کر فون اٹھایا۔ بھیا کے کسی دوست کا فون تھا۔ فون پر بات ختم ہونے کے بعد میں نے ماں سے پوچھا، ماں، کیا یہ وہی عورت ہے جو کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

''ہاں، یہ اسی مہندر نائی کی بیوی ہے جو اپنے کرایہ دار کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔''

''کہاں گئی تھی؟''

''مظفر پور گئی تھی۔''

''پھر۔۔۔؟''

''پھر کیا، وہ کرایہ دار تین مہینے کے بعد اسے برونی میں نارتھ ایسٹ ایکس پریس میں بٹھا کر کہیں غائب ہو گیا تھا۔

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر ایک دن خود ہی وہ کسی ٹرین سے مہندر کے گھر واپس آ گئی۔''

''مہندر نے کیا اسے پھر قبول کر لیا؟''

''اس بچارے کے پاس چارہ بھی کیا تھا؟ اس کے پاس چار بچوں کی پرورش کا مسئلہ بھی تو تھا۔ اس نے اسے معاف کر کے پھر سے قبول کر لیا تھا۔'' یہ کہہ کر

ماں رسوئی میں چلی گئی تھی۔میرے ذہن میں بیس سال پہلے کی بات پھر سے نمو دار ہوئی۔اس وقت پتا جی زندہ ہی تھے مہندر شہر کا سب سے مصروف نائی تھا۔وہ میرے گھر آکر میرے اور میرے بھائی بہنوں کے بال تراشا کرتا تھا۔اس کی گھر والی بھی آکر خواتین کے ناخن وغیرہ کاٹ جایا کرتی تھی۔بعد میں پتہ چلا تھا کہ وہ ایک بیٹی کو پیدا کر کے چل بسی تھی۔اور پھر اس بیٹی کی پرورش کے لئے مہندر نے دوسری شادی کر لی۔چالیس سال کا مہندر اور بیس سال کی للتا کی جوڑی کو دیکھ کر گاؤں کے لوگوں کو تھوڑا عجیب تو لگا لیکن چھوٹی بچی کی دیکھ بھال کے لئے یہ ضروری بھی تھا۔للتا کے پتا کافی مفلس تھے۔مہندر کے پاس کافی دولت دیکھ کر انہوں نے اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔

للتا بہت خوبصورت تھی۔کالیداس کی شکنتلا سے کم نہ تھی۔اس پھول کو واقعی اب تک کوئی خراش نہیں لگی تھی اور نہ ہی کسی نے اسے اب تک سونگھا ہے۔اور یہ پھول قسمت سے مہندر کے آنگن میں آگرا۔بعد میں پچھلی اہلیہ کی طرح للتا بھی میرے گھر ناخن کاٹنے آنے لگی۔ہم سبھی بھائی بہن اسے بھی ''بھابھی جی'' سے خطاب کرنے لگے۔وہ بھی ہم سبھوں سے دیور اور نند جیسا خلوص و محبت رکھتی تھی۔ہنسی مذاق کرتی تھی۔ایک بار میں نے پوچھا بھی تھا،''بھابھی جی، ابھی تو آپ جوان ہیں اور مہندر بھائی بڈھے ہونے والے ہیں، پھر کیسے چلے گا؟''

''جب آپ جیسا نوجوان دیور میرے پاس ہو تو بھائی صاحب کی

کیا ضرورت ہے بھلا۔۔۔؟'' للتا نے بھی پلٹ کر جواب دیا تھا اور پھر زور زور سے ہنسنے لگی تھی۔ آس پاس کے لوگ بھی ہنسنے لگے تھے۔ ویسے میری عمر پندرہ سال کے قریب ہوگی۔ آس پاس کے لوگوں نے تو اس کے مذاق کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ لیکن میرے نوجوان ذہن میں اس کی یہ بات ایک میٹھی گدگدی کرتی چلی گئی۔ اس وقت میں نویں کلاس کا طالب علم تھا۔ میری کلاس میں بھی کئی اَنسنگھے پھول تھے۔ لیکن ان کا صرف دیدار ہی ممکن تھا۔ ان کے ساتھ گفتگو یا ہنسی مذاق بالکل ہی منع تھا۔ لہذا دل ہمیشہ پیاسا ہی رہتا تھا۔ ایسے میں اس خوبصورت بلا کا اس قدر پر خلوص مذاق آبِ حیات کی مانند تھا۔

اس سال پتاجی نے مجھے شہر کے باہر کے ایک اسکول میں پڑھنے کے لئے بھیج دیا تھا۔ وہیں سے دسویں اور پھر بارہویں کرنے کے بعد میں بی۔ اے۔ کرنے پٹنہ یونیورسٹی چلا گیا تھا۔ وہیں گوپال نے اطلاع دی کہ ٹھاکر گنج میں مہندر کی بیوی کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

''وہ ایسی بدچلن لگ تو نہیں رہی تھی!'' میرا سوال تھا۔

''کیا کہہ سکتے ہیں؟'' گوپال کے پاس کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

''لیکن چار چار بچوں کو پیدا کر کے اسے کسی کے ساتھ بھاگنے کی کیا ضرورت آپڑی؟''

''مجھے تو لگتا ہے مہندر اور للتا کی عمر میں بیس سالوں کا فرق ہے شاید یہی فرق

اس کے بھاگنے کی وجہ ہو۔'' گوپال کا قیاس تھا۔

''کس کے ساتھ بھاگی تھی؟''

''اس کا اپنا ہی کرایہ دار سریندر لال تھا۔ اس وقت اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ان دنوں اپنے باپ کی تجارت میں ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ لیکن للتا کے متعلق اس نے اپنے باپ کو بھی اندھیرے میں رکھا۔''

''للتا اپنے ساتھ گہنے بھی لے گئی تھی کیا؟''

''ہاں، بیس ہزار روپے تک کے زیورات اس کے پاس تھے۔'' گوپال نے بتایا تھا۔

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر جب سارے گہنے و روپے ختم ہو گئے تب سریندر اسے ایک ٹرین میں بٹھا کر کہیں غائب ہو گیا'' یہ کہہ کر گوپال کالج کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

اس حادثے کو چودہ سال گزر چکے ہیں۔ اس درمیان پتا جی کا بھی انتقال ہو گیا۔ مہندر کی ماں بھی نہیں رہی۔ مہندر کے سارے بچے بڑے ہو چکے تھے۔ اس کی بیٹی اور سب سے بڑے بیٹے کی شادیاں بھی ہو چکی تھیں۔ للتا نے ایک پوتے کا منہ بھی دیکھ لیا ہے پھر بھی اس کے چہرے پر اس قدر نور۔۔۔

''آ جاؤں کیا؟'' دروازہ پر دستک ہوئی۔

''ہاں، ہاں، آ جائیے!'' سامنے دیکھا تو للتا مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ

میں چائے کی پیالی تھی۔ اس نے میرے ہاتھ میں وہ پیالی پکڑا دی۔ ''لیجئے، میں دوسری پیالی لے آتی ہوں'' اور وہ رسوئی میں جا کر دوسری پیالی لے آئی اور چپک کر میرے ساتھ میرے پلنگ پر ہی بیٹھ گئی۔

''اب بتائیے کیا حال ہیں آپ کے؟ آپ تو دہلی جا کر مجھے بھول ہی گئے۔ کیا وہاں کوئی اور مل گئی ہے؟'' اس کی آواز میں اب بھی وہی شوخی و شرارت موجود تھی۔

''آپ جیسی خوبصورت بھابھی کو چھوڑ کر کون جاہل کسی اور کی طرف دیکھنے کی ہمت کر سکتا ہے!''

''دہلی جا کر باتیں بھی کرنی آ گئی ہیں!''

''اور سنائیے، کیسا چل رہا ہے؟ گھر میں سب خیریت تو ہے؟ مہندر بھائی خیریت سے تو ہیں؟'' میں نے سارے دعوت نامے بڑے لفافے میں ڈال دئے اور للتا کے ساتھ چائے کی چسکیاں لینے لگا۔

''نلن جی، آپ سبھوں کی دعاؤں سے سب ٹھیک ہی چل رہا ہے۔ پچھلے سال گنیش کی شادی کی۔ پچھلے مہینے اس کے یہاں ایک بیٹا بھی ہوا ہے۔ نریش، دلیپ اور سدھیر ابھی اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ آپ کے بھیا کی ہی صرف صحت ٹھیک نہیں رہتی۔

''کیوں! کیا ہوا! وہ تو کافی صحت مند تھے؟''

''ان کا ہاضمہ بالکل ہی بگڑ گیا ہے، تلی ہوئی چیزیں تو بالکل ہی نہیں پچتیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں!''

''سلی گوڑی جا کر کسی اچھے ڈاکٹر سے کیوں نہیں دکھلاتیں؟''

''''سب کر کے دیکھ چکی ہوں، کوئی فائدہ نہیں ہو رہا۔'' للتا کی آواز اچانک بھرا گئی تھی۔

''چائے پیجئے، ٹھنڈی ہو رہی ہے!'' میں نے موضوع تبدیل کرنے کی غرض سے کہا۔

''پی رہی ہوں ـــــ!'' اور وہ چپ چاپ چائے پینے لگی۔ تھوڑی دیر ہمارے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ مجھے تو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ للتا جیسی حسین و شوخ خاتون اس قدر خاموش بھی ہو سکتی ہے۔ خیر میں نے بات بدلی، ''اور سنایئے بھوجی، آپ کا سیلون کیسا چل رہا ہے۔؟''

''اور سب ٹھیک ہے۔ گنیش سیلون چلا رہا ہے۔ باقی چھوٹے تینوں تو اسکول ہی جاتے ہیں۔ ان کی تعلیم میں کوئی رکاوٹ نہ آئے اس لئے ان میں سے کسی کو بھی گنیش سیلون میں نہیں بلاتا۔ سارے کام خود ہی دیکھتا ہے۔ اس کی گھر والی بھی اوپر والے کی دعا سے بہت اچھی آئی ہے۔ گھر کا سارا کام سنبھال رہی ہے۔''

''سارے کام جب ٹھیک چل رہے ہیں تب آپ کیا کرتی ہیں؟'' میں نے تھوڑا انداق کرتے ہوئے چھیڑا۔

''میں تو کچھ بھی نہیں کرتی ،صرف آپ کے بھیا کی خدمت کرتی ہوں ۔اگر تھوڑا وقت ملتا ہے تو تھوڑا سماجی کام انجام دیتی ہوں۔''

''سماجی کام۔۔۔۔؟''

''ہاں نلن جی! میں اپنا دھیان بٹانے کے لئے کچھ سماجی و سیاسی کاموں میں حصہ لیتی رہتی ہوں''۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایک نائی کی بیوی اور سیاست میں دخل، کیسے ہوسکتا ہے۔خیر اس کا دل رکھنے کے لئے میں نے کہہ دیا تھا،'' بھابھی،آپ نے تو کافی ترقی کرلی ہے!''

''سب اس بزرگ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔''اس نے دیوار پر ٹنگی میرے پتا جی کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''نلن جی،آپ نہیں جانتے ہیں دس سال پہلے جب میرے قدم بہک گئے تھے، میں اس سور کی باتوں میں آگئی تھی اس وقت میں پورے شہر کے لوگوں کے غصے کا شکار ہوگئی تھی۔سبھی مجھے گاؤں سے نکالنے پر آمادہ تھے۔اس وقت آپ کے پتا جی نہ ہوتے تو سبھی میری جان ہی لے لیتے۔اس بھری بھیڑ میں سے صرف ایک آدمی میری دفاع میں نکل کر میرے سامنے آیا اور کہا،' کیا ہوا اگر للتا کے قدم بہک گئے! یہ تو کسی کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے! ہماری بھی بہو بیٹیاں ہیں۔اگر للتا اب صحیح راستے پر چلنا چاہتی ہے تو ہمیں اسے معاف کرکے اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔' نلن جی آپ کو یقین نہیں ہوگا چچا جان کے ان الفاظ

کے بعد سبھوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ سبھی دھیرے دھیرے اپنے گھروں کو کھسک گئے تھے۔''

''پھر۔۔۔۔؟''

''پھر چچا جان نے آپ کے بھیا کو بلا کر کہا تھا، مہندر! تمہاری للتا واپس آ گئی ہے اسے قبول کرلو۔ بڑا وہی ہوتا ہے جو معاف کرنا جانتا ہے۔ اور پھر آپ کے بھیا مجھے گھر لے گئے تھے۔''

''اے للتا جلدی آ۔ سمت آ گیا ہے۔ جلدی سے اس کے ناخن کاٹ دے۔'' اسی درمیان باہر آنگن سے ماں کی آواز آئی تھی۔ بھیا باہر سے آ گئے تھے۔ انہیں کے ناخن کاٹنے کے لئے للتا کو بلایا گیا تھا۔

''جاتی ہوں، کبھی مجھے بھی تو دہلی لے چلئے۔ آپ کے ساتھ مجھے بھی ایک بار دہلی گھومنے کا جی کرتا ہے!''

''میرے ساتھ۔۔۔؟ پھر ہنگامہ ہوگا۔'' میں نے پھر اسے چھیڑا۔

''اب کاہے کا ہنگامہ، اب کہاں رہی میں بیس سال والی للتا، اب تو پوتے والی ہوگئی ہوں۔ اور پھر اس بار دیور کے ساتھ جاؤنگی، کسی اور کے ساتھ تو نہیں۔ لے چلیں گے نہ؟''

''ضرور۔۔۔!'' اور پھر وہ ناخن کاٹنے چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں پھر دعوت ناموں پر نام اور پتے لکھنے لگا۔ تقریباً اسی لفافے ایسے تھے جن پر

نام و پتے لکھنے تھے۔ سات بج چکے تھے۔ لگتا ہے رات میں بھی تھوڑی دیر جاگنا پڑیگا۔ اسی درمیان دروازے پر پھر دستک ہوئی ''نلن جی گھر میں ہیں کیا؟''

''اچھا، مامی جی ہیں آیئے!'' سامنے پڑوس کی شوبھا مامی تھی۔

شوبھا مامی گاؤں کی سب سے خوبصورت خواتین میں سے ایک ہیں۔ چونکہ وہ میری ہم عمر تھیں اس لئے ہم انہیں چھیڑتے رہتے تھے۔ وہ بھی پیچھے نہیں رہتی تھیں''۔کیا بات ہے اس نائی کی بیوی کے ساتھ کیا چل رہا تھا؟''

''کیا مامی جی، آپ بھی۔۔۔؟ آپ اس کو جانتی ہیں کیا؟''

''اسے شہر میں کون نہیں جانتا؟''

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کو نہیں پتہ یہ شہر کی ایک سیاسی پارٹی کے خاتون ونگ کی صدر ہے؟''

''اچھا!''

''اور کیا! اس کے پیچھے تو شہر کی ڈھیر سی عورتیں ہیں۔ اس کے ایک اشارے پر عورتیں مرنے مارنے کو تیار رہتی ہیں۔''

''اچھا!''

''اور کیا!''

''پھر بھی یہ ناخن کاٹتی ہے!''

''ناخن کاٹنا تو اس نے بہت پہلے ہی چھوڑ دیا ہے۔ یہ تو صرف آپ کے گھر

میں ہی کاٹنے آتی ہے۔اور کہیں نہیں جاتی۔آپ کی ماں سے نہ جانے کس جنم کا اس کا تعلق ہے کہ صرف ایک اشارے پر ہی جان ہتھیلی پر لے کر آ جاتی ہے۔اچھا جاتی ہوں، سبھی گانے والیاں آ چکی ہیں۔'' یہ کہہ کر مامی جی باہر نکل گئیں۔ باہر شاید لیڈی سنگیت کا پروگرام شروع ہونے ہی والا ہے۔ مامی جی تمام گانے والیوں میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔تھوڑی دیر میں ہی باہر للتا کی خوبصورت آواز سے لیڈی سنگیت کا آغاز ہوا۔آس پاس کی خواتین میں پھر واہ واہ کی آوازیں صاف سنائی پڑ رہی تھیں۔میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا یہ وہی للتا ہے جو کبھی تمام خواتین کے لئے باعث نفرت تھی اور آج پھر وہی تمام عورتوں سے شہرت بٹور رہی ہے۔

ڈاکٹر پرمود بھارتیہ پچھلے دس بارہ سالوں سے مسلسل ہندی اردو انگریزی اور سنسکرت زبانوں میں افسانے لکھ رہے ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں ان کا سنسکرت میں ایک افسانوی مجموعہ منظر عام پر آیا تھا جسے ۲۰۰۰ء میں پرتاپ نارائن مشر میموریل ایوارڈ سے نوازہ گیا۔ اردو میں بدچلن عنوان سے یہ پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس میں بارہ افسانے ہیں۔ اس کے زیادہ تر افسانے ماضی میں دیگر رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔ ان کے تقریباً سبھی کردار قارئین کے آس پاس ہی کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی کئی کہانیاں آل انڈیا ریڈیو پر بھی نشر ہوئیں۔

ڈاکٹر پرمود بھارتیہ ۲۰ ستمبر ۱۹۶۵ء کو صوبہ بہار کے کھگڑیہ ضلع کے نیا گاؤں گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم نیا گاؤں کے علاوہ ٹھاکر گنج میں ہوئی۔ ٹی۔ این۔ بی۔ کالج، بھاگل پور، پٹنہ کالج، پٹنہ اور کروڑی مل کالج، دہلی میں باقی تعلیم انہوں حاصل کی۔ دہلی یونیورسٹی سے ہی انہوں نے ایم فل اور پی ایچ ڈی حاصل کی۔ بعد میں انہوں نے انگریزی ادب میں بھی ایم اے کیا۔ دہلی یونیورسٹی کے ذاکر حسین ایوننگ کالج میں ایک سال پڑھانے کے بعد پچھلے سات سالوں سے وہ مسوری کے میونسپل پوسٹ گریجویٹ کالج میں سنسکرت ادب پڑھا رہے ہیں۔

مصنف کی دیگر تصانیف

۱۔ فوریمن ناولس آف سنسکرت

۲۔ سہاگنی (سنسکرت افسانے)